قیدِ فرنگ

مولانا ظفر علی خاں علیہ الرحمۃ کے ایّامِ اسیری

شورش کاشمیری

کتاب مجموعه رسایل

به قلم [illegible]

قیدِ فرنگ

مولانا ظفر علی خاں علیہ الرحمۃ کے ایّامِ اسیری

تحریر

شورش کاشمیری

جون ۱۹۶۷ء

ناشر	مطبوعاتِ چٹان لمیٹڈ لاہور
طابع	چٹان پرنٹنگ پریس لاہور
قیمت	دو روپے
بار اوّل	ایک ہزار

رجسٹرڈ ایل نمبر 1233 — ٹیلیفون نمبر 2605

نصر من اللہ و فتح قریب

یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواههم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن + پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

سنڈے ایڈیشن

روزنامہ

زمیندار

ایڈیٹر:- اختر علی خاں — قیمت ۱/ — قیمت ۱/

شرح اجرت اشتہارات فی اشاعت

ایک صفحہ یا پانچ سو انچ کا ٹھیکہ کرنے والوں کے لئے خاص رعایت جو بذریعہ خط و کتابت دریافت ہو سکتی ہے
مینیجر صیغۂ اشتہارات

شرح چندہ زمیندار

سالانہ — ششماہی — سہ ماہی

مینیجر زمیندار

باہتمام اختر علی خاں پرنٹر و پبلشر منصور سٹیم پریس لاہور میں چھپ کر دفتر زمیندار لاہور بیرون دہلی دروازہ سے شائع ہوا۔

جلد ۱۴ — لاہور - یوم یکشنبہ - ۸ جمادی الثانی ۱۳۴۶ھ مطابق ۴ - دسمبر ۱۹۲۷ عیسوی — نمبر ۲۶۸

پیامِ وقت

جو کرنی ہے جہانگیری محمد ﷺ کی غلامی کر
عرب کا تاج سر پر رکھ خداوندِ عجم ہو جا

ہو سرکش سرو کی مانند گر باطل نکالے سر
اگر حق آگے آئے ماہِ نو کی طرح خم ہو جا

صنم خانہ میں گو کلیوں کی رعنائی سے پھیر آنکھیں
دوئی سے کٹ کے یثربیوں کی یکتائی میں ضم ہو جا

چراغِ دیر سے جل کر بھی آخر راکھ اڑنی ہو
تو پھر شمعِ حرم سے لو لگا کر ہی بھسم ہو جا

اگر سورج کو شرمانا ہے اپنی ضو فشانی سے
تو بن ابنِ سعود اور ذرۂ خاکِ حرم ہو جا

امان اللہ خاں کا درد اپنے دل میں پیدا کر
کفِ ساقی سے یہ جامِ جہاں بیں لے کے جم ہو جا

سبق اس انکسارِ نفس کا اب ہم کو ملنا ہے
کہ برکن ہیڈ بڑھے جتنا بھی تو اتنا ہی کم ہو جا

کرانا ہے قلم ہاتھوں کو رودادِ جنوں لکھ کر
تو اس دورِ ستم پرور میں میرا ہم قلم ہو جا

پشاور - ۳۰ - نومبر ۱۹۲۷ء

ظفر علی خاں

اس
کے
بعد

شیخ الہند مولانا محمود الحسن

مولانا محمد علی جوہر

مولانا حسرت موہانی

مولانا ابو الکلام آزاد

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری

چوہدری افضل حق

مولانا حسین احمد مدنی

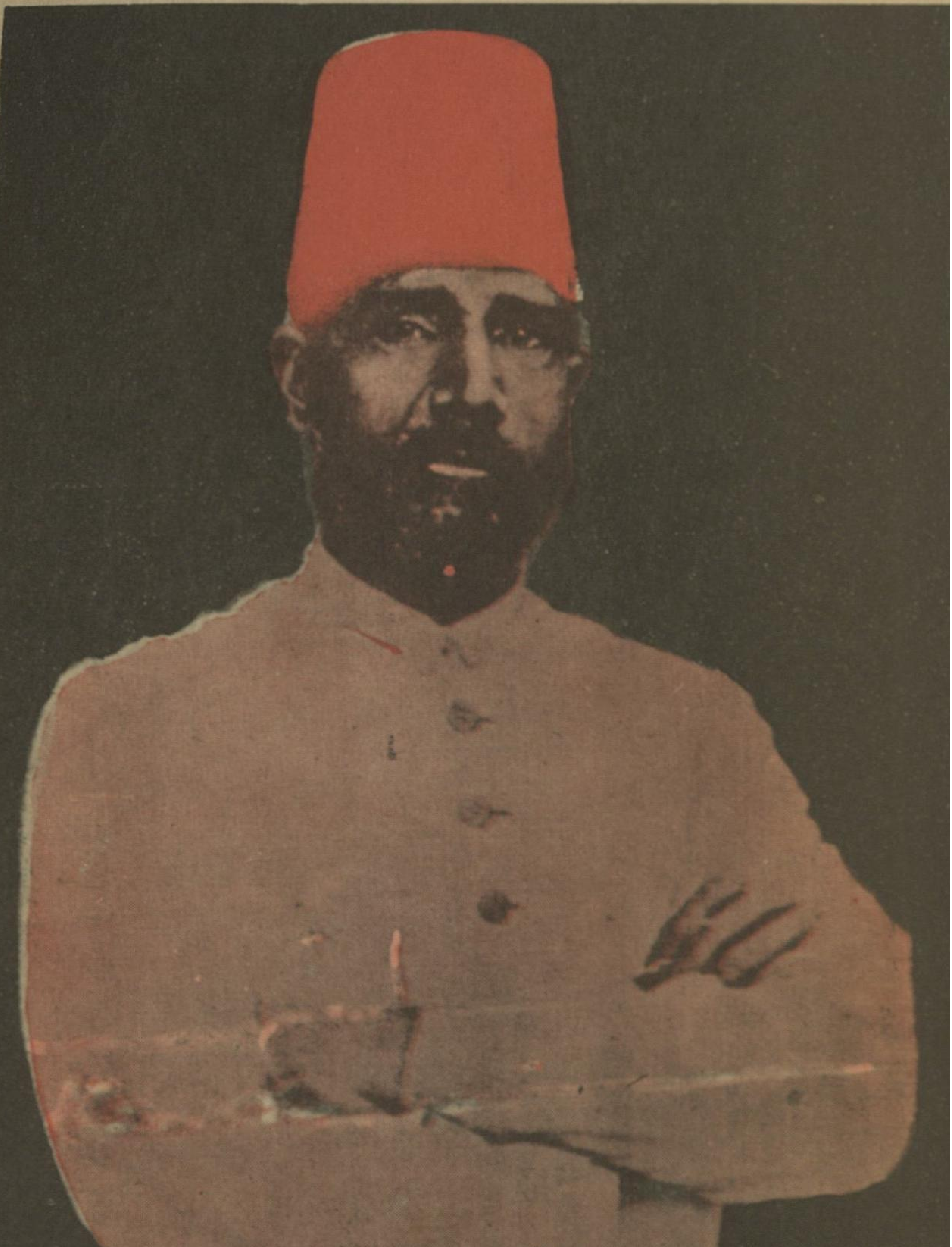
مولانا محمد جعفر تھانیسری

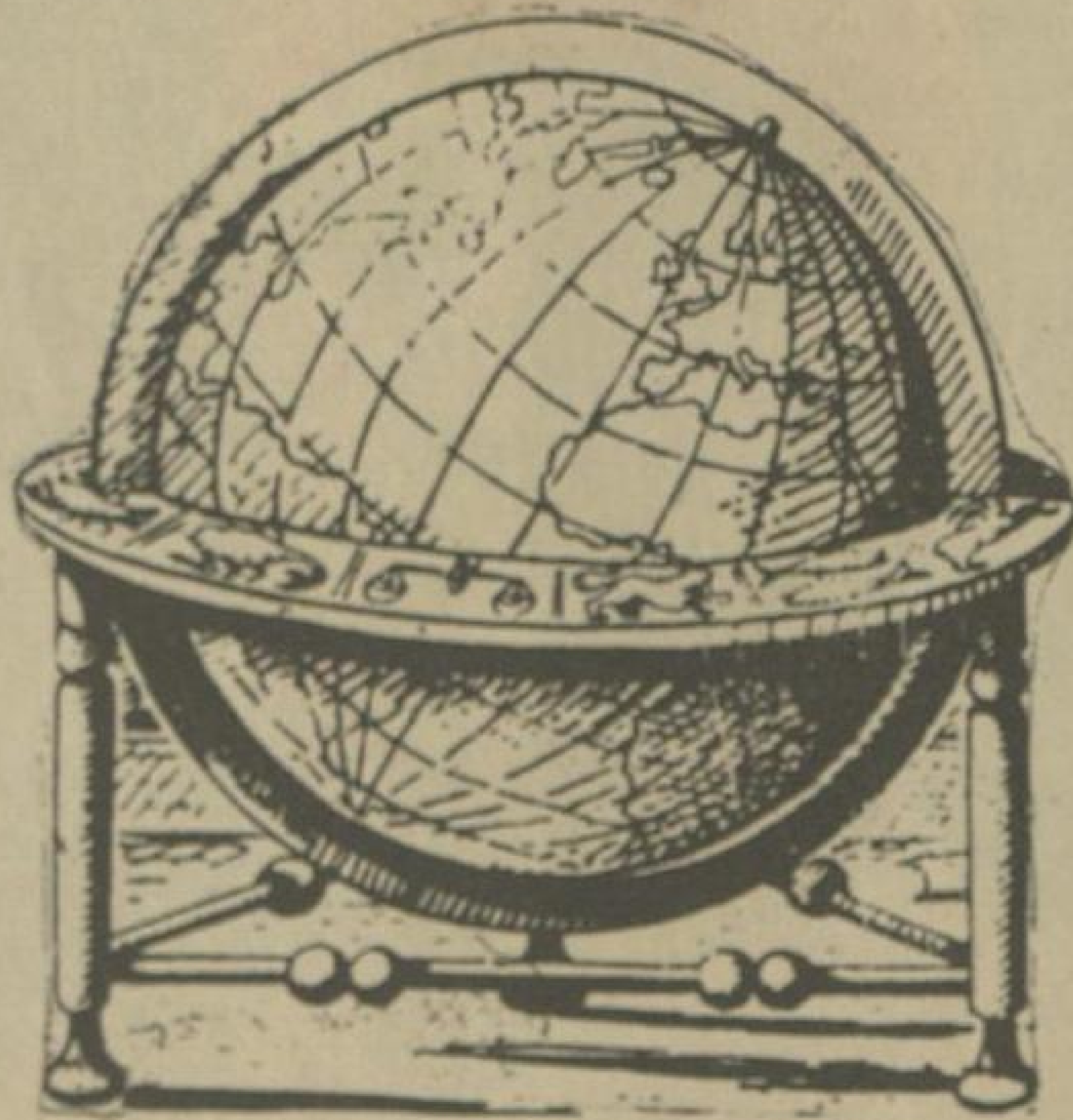
کی داستان ہائے اسیری زیرِ تسوید ہیں

سیاسی جاسُوسوں کے نام

موت سے پہلے آدمی ان سے نجات پائے گیوں ۔

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست





طابع و ناشر

مطبوعات چٹان لمیٹڈ

۸۸ - میکلوڈ روڈ - لاہور

مغربی پاکستان

حرفِ اوّل

مولانا ظفر علی خاں کے ایام اسیری کا یہ تذکرہ کچھ اُن کی اور کچھ میری زبانی ہے الفاظ سب کے سب میرے ہیں مطالب اُن کے ہیں، اور اشعار جو اس داستان میں "تذکرۃً" آ گئے ہیں مولانا کی تراوشِ فکر کا نتیجہ ہیں۔ یہ بھُولی بسری یادوں کو جمع کرنے کی ایک کوشش ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا میرے حافظے نے کہاں تک میرا ساتھ دیا ہے۔ بہرحال جو باتیں میں نے لکھی ہیں وہ کچھ تو اپنی یادداشتوں سے ماخوذ ہیں کچھ ثقہ روایتوں سے، اور کچھ مولانا کے کلام سے مستعار لی ہیں، کوشش یہی کی ہے کہ مولانا ہی کی زبان میں ان کے جوابات تحریر ہوں۔ اب اس امر کا فیصلہ قارئین ہی کر سکتے ہیں کہ مجھے اس میں کہاں تک کامیابی ہوتی ہے جہاں تک روایتوں اور حکایتوں کا تعلق ہے مَیں نے ہر بات احتیاط کی ترازو میں تول کر لکھی ہے۔ میرے نزدیک واقعات و بیانات کی صحت ہی سے تاریخ کا

حسن باقی رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کسی مقام پر کوئی جھول ہو کیونکہ یہ واقعات قریب قریب تینتیس ۳۳، چونتیس ۳۴ برس پہلے کے ہیں اور آدمی کا حافظہ کہاں تک ان واقعات کی جزئیات کو ساتھ لیکر چل سکتا ہے۔ تاہم اپنی طرف سے میں نے ایک ایک لفظ تول تول کر لکھا ہے ـــــ زبان میری ہے بات اُن کی

اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی ہے یا کوتاہی ہوئی ہے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے، اور اگر اس میں کہیں کوئی خوبی ہے یا بیان کا زور ہے تو یہ مولانا کے تصرفات ہیں ـــــ حقیقتاً یہ ایک المیہ ہے کہ ہمارے ہاں قومی جدوجہد کی تاریخی روایت اپنے اصل مرکز سے ہٹی ہوئی ہے۔ ہم نے قریب قریب اُن تمام لوگوں کو متروکات سخن کا درجہ دے دیا ہے جو برٹش امپریلزم کے خلاف لڑتے رہے اور جنہوں نے اس جدوجہد میں قید و بند کی مختلف العنوان سختیاں جھیلیں حادثہ یہ ہے کہ اس خوبی کے لوگوں کو بعض زبان درازوں نے نرغہ میں لے رکھا ہے، چوروں جیب تراشوں اور کوکین فروشوں کے لیے تو جگہ ہے کہ اپنے کارناموں پر فخر کرسکیں مگر اُن لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں جو حصولِ آزادی کی راہ میں قید و بند کے مرحلے گذار چکے ہیں۔

اس خیال نے میرے ذہن کو مدت سے ہلا رکھا تھا میں سوچتا رہا کہ اُن لوگوں کا تذکرہ لکھوں جو ان پُرخار وادیوں میں تلوے سہلاتے اور حالات کی سنگینی کا تماشا تکتے رہے ہیں۔

قید کی کہانی ایک سلسلہ ہے جو اُن لوگوں کے خود نوشتہ یا خود فرمودہ زندانی حالات پر مشتمل ہوگا، جنہوں نے برطانوی استعمار کے خلاف عمر بھر جد وجہد کی لیکن جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو نہ صرف اُن کے مقام و مرتبہ سے آنکھیں پھیر لی گئیں بلکہ اُن کی قدر و قیمت ہی کو پیوندِ خاک کر دیا گیا۔

مَیں نے مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں اس سے پہلے بھی ایک کتاب لکھی ہے لیکن وہ اُن کی ہمہ گیر شخصیت کا مطالعہ ہے جس میں مولانا کی زندگی کے سوانح، افکار اور سیاسیات وغیرہ کا ذکر ہی نہیں تجزیہ بھی ہے یہ اوراق ان کی اسارتی زندگی کی تصویر پیش کرتے اور شروع سے آخر تک انہی ایام کے گرد گھومتے ہیں۔ مولانا نے جو کچھ "زمیندار" میں لکھا یا "زمیندار" میں اُن کے بارے میں جو کچھ چھپتا رہا افسوس کہ محفوظ نہیں رہا اور نہ دستیاب ہوتا ہے۔ "زمیندار" کے فائل ہی دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکے ہیں۔ اگر "زمیندار" کے فائل محفوظ ہوتے تو ان کے سوانح حیات یا اس قسم کے موضوعات کا مرتب ہونا چنداں مشکل نہ تھا۔ لیکن مولانا کی خطابت اور صحافت بالکل ہی مفقود الخبر ہے اس کے آثار و مظاہر اُن کے مجموعہ ہائے کلام میں رہ گئے ہیں لیکن ان میں بھی ایک خرابی ہے، مولانا کی نظموں کا پس منظر اور اس پس منظر کے افراد و واقعات کی تصویریں جب تک خط و خال سمیت معلوم نہ ہوں ہم ان اشعار سے بکمال و تمام لذت آشنا نہیں ہو سکتے۔ مولانا کے ہاں مستقل حیثیت کے اشعار کل اشعار کا ایک تہائی ہیں۔ وہ نہ غالب ہیں نہ اقبال یا اکبر وہ

ایک سیاسی وقائع نگار ہیں جن کے ہاں ایک خاص ادا کے بوقلموں واقعات کی زنگارنگ تصویریں ملتی ہیں۔ امر واقعہ ہے کہ ہم ظفر علی خاں کی شاعری سے ایک خاص دور کی سیاسی تاریخ کے اکثر و بیشتر اصول و کوائف معلوم و مرتب کر سکتے ہیں —— آج وہ لوگ زندہ ہیں جو ان واقعات و افراد کی نشاندہی کر سکتے اور اس طرح ظفر علی خاں کی شاعری کا ایک فرہنگ بنا سکتے ہیں۔ اگر کل کلاں یہ خلا بھی پیدا ہو گیا تو پھر دو ہی صورتیں رہ جائیں گی۔ اولاً قومی شاعری کا یہ سرمایہ فنا کی گود میں چلا جائے، ثانیاً جب اس کے شناسا نہ رہیں تو ہم انہیں پہیلیوں کی طرح حل کرتے پھریں۔ مولانا کے دیوان میں سینکڑوں اشعار ہیں جن سے ان کی اسارتی زندگی سن وار مرتب ہو سکتی ہے، حتیٰ کہ قید و بند کی جزئیات معلوم کی جا سکتی ہیں۔ بلکہ ان اشعار سے مولانا کا داخلی مطالعہ بھی ہو سکتا ہے۔ مولانا نے ان اشعار میں سیاسی حالات کی تصویر کشی بھی کی ہے، اور اپنے ساتھیوں کے قید ہونے اور مصائب سہنے کی حکایت طرازی بھی —— مولانا کے کلام میں حبسیات کا ایک ایسا بڑا حصّہ ہے جو حواشی کے ساتھ ایک معلومات افروز تاریخی دستاویز بن سکتا ہے۔ اس کتاب ہی میں دو ایک جگہ بعض اشارات موجود ہیں، جن میں مولانا کی حبساتی شاعری کے بعض خفی و جلی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ انسان جیل میں مجموعۂ افکار ہوتا ہے۔ کئی طرح کے متضاد خیالات اُس کے ذہن کا احاطہ کرتے ہیں۔ مولانا ہر مرحلہ اور ہر موڑ میں اپنی ہی دُھن کے پکّے رہے اُن کی شاعری کا عظیم وصف اُن کی نعت گوئی ہے۔ یہ ایک عجیب پہلو ہے

کہ مولانا نے اپنی زندہ جاوید نعتیں زیادہ تر جیل ہی میں حوالہ قلم کی ہیں۔ مولانا کی شاعری میں اجتماعاً تلخی زیادہ ہے اور شیرینی کم، بالفاظ دیگر وہ رنگینی سے زیادہ سنگینی کے طرفدار ہیں، لیکن جہاں تک ان کی جسیاتی شاعری کا تعلق ہے اس میں "طمانچہ بر رخسارِ فرنگ" کا زناٹا تو ہے، لیکن طنز و ہجو کا فراٹا نہیں کہ عام حالات میں ان کے جگری دوست، سیاسی ہمسفر اور اخباری معاصر طنز و ہجو سے زخم کھاتے رہے ہیں۔ جسیاتی شاعری میں انہوں نے حمد کہی ہے، نعتیں لکھی ہیں، واقعات کو منظوم کیا ہے، کچھ حدیثوں کا اشعار میں ترجمہ کیا، اپنے نفس کے واردات لکھے اور قومی تحریک کے اُتار و چڑھاؤ کی نقاشی کی ہے۔ غرض اُن کے کلام کا وہ مرقع جو "جسیات" کے نام سے منسوب ہے اُن کی زندگی کے اس حصّے کی عکاسی کر رہا ہے، ہم اس سے نہ صرف قومی جد و جہد کی سیاسی تاریخ کے خطوط حاصل کر پاتے ہیں بلکہ اُن کا مُطالعہ بعض اعتبارات سے نہایت فائدہ مند ہے۔

مَیں نے اپنی کتاب "ظفر علیخاں" میں بصراحت لکھا ہے کہ ظفر علی خاں کی شاعری نے عوامی اذہان پر بحیثیت تحریک کے سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے۔ علامہ اقبالؔ کا معاملہ بالکل دوسرا ہے، وہ مسلمانوں کے ذہنی ارتقا کی ایک اثباتی تاریخ مرتب کرتے ہیں لیکن جہاں تک روزمرّہ کی سیاسی زندگی میں اثر انداز ہونے اور لوگوں کو جد و جہد میں آمادہ کرنے کا سوال ہے، مولانا ظفر علی خاں ہر لحاظ سے پاکستان کے سب سے بڑے سیاسی اور عوامی شاعر تھے جن کا کلام اُن کے بڑھاپے میں بھی

جو اَن رہا، ملال یہ ہے کہ جس کلام نے یہ معجزہ کیا تھا، آج اپنوں ہی کے اغماض کی بدولت گلدستۂ طاق نسیاں ہو رہا ہے۔

قید کی کہانی اس تن آور درخت ہی کی ایک شاخ ہے اور اس کی ترتیب و تسوید کا ایک ہی مقصد ہے کہ مستقبل کی نسلیں یہ جان لیں کہ ؏

اپنی خاکستر میں کچھ چنگاریاں ایسی بھی تھیں

شورش کاشمیری

• تحریر ستمبر ۱۹۶۳ء • طباعت جون ۱۹۶۷ء

مولانا ظفر علیخاںؒ کی طبیعت میں تلوّن تھا لیکن عادتیں ان کی پختہ تھیں۔ صبح کی سیر اُن کا روزمرہ تھا۔ حقّہ ضرور پیتے تھے اور اُن کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ زبردست حُقّی ہیں۔ لیکن حُقّہ پینے نہیں دُھواں چھوڑتے تھے۔ اُنہیں تماکو پینے کے بجائے دُھواں اُڑانے میں زیادہ لُطف محسوس ہوتا۔ فلم اور نَے اُن کے معتمد خاص تھے اُن کا کوئی صدیق مکرّم نہ تھا۔ نہ وہ خود کسی کے دوست تھے اور نہ اُن کا کوئی دوست تھا، حتیٰ کہ اُن کے ساتھی بھی اُن کے ساتھی نہ تھے عموماً ہر شخص سے فریب کھا جاتے وہ بدیر یا سویر دُور ہو جاتا۔ جن لوگوں کو میں نے قریب سے دیکھا مولانا اُن میں سرِفہرست ہیں، لیکن میرا مشاہدہ بھی یہی ہے کہ جو لوگ انہیں راہنما مان کر رفیقِ سفر ہوتے اکثر راستہ ہی میں چھوڑ جاتے تھے۔ یہ لوگ جب آپس میں یکجا ہوتے تو مولانا کے تلوّن کو زیرِ بحث لاتے اور غیبت کی روشوں پر مزے مزے سے چہل قدمی

کرتے تھے۔ یہ تو ساتھیوں یا پیروؤں کا معاملہ تھا، "زمیندار" میں جو لوگ ایڈیٹر ہو کر آتے رہے اُن کا بھی یہی حال رہا (اِلّا ماشاء اللہ) ایک چراغ حسن حسرت مستثنےٰ تھے جنہوں نے مرتے دم تک مولانا کے کمالات کا اعتراف کیا باقی جو لوگ "زمیندار" میں شریک ہو کر مدیر شہیر ہو گئے اپنے ہی کمالات کو ان کے کمالات پر فوقیت دیتے رہے اور یہ ایک دو کی نہیں تقریباً سب کی بات ہے۔

اب ان کی یاد یا تذکرہ تغافل کا شکار ہے تو اُس کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ مولانا دوستوں سے محروم تھے، اگر اُن میں تلوّن تھا تو جو لوگ اُن کے مخالف تھے اُن میں حَسد تھا وہ مولانا کی بھرپور شخصیت سے خار کھاتے تھے۔ ان دیکھتی آنکھوں کے سامنے نا اہل لوگ بھی افسانہ ہو گئے اور یارانِ سرِپُل نے انہیں فرش سے عرش پر بٹھا دیا، مگر مولانا جیسے متروکاتِ سخن میں سے ہیں یا پھر طاقِ نسیاں کا چراغ کہ اُسے بھی موت نے ٹھنڈا کر دیا ہے۔

اپنی تحریروں میں جتنا وہ تند و تیز نظر آتے ہیں اُتنا ہی اپنی طبیعت کے اعتبار سے نرم و نازک تھے، یہ ایک عجیب و غریب تضاد ہے کہ اُن کی شاعری میں ہجو کی شدت تھی اور اس باب میں اتنے سخت تھے کہ اُن کا قلم اکثر و بیشتر واشگاف ہو جاتا لیکن بول چال میں حیدر آباد کے شرفا کا رکھ رکھاؤ تھا۔ میں نے برسوں کی یکجائی اور مہینوں کی ہمسفری کے باوجود ان کی زبان سے کبھی گالی نہیں سنی معلوم ہوتا تھا کہ وہ گالی سے آشنا ہی نہیں ہیں۔ ہاتھ کے سخی، دل کے غنی اور کان کے

کہتے تھے مگر باتونی نہیں تھے۔ نہ تو کبھی انہیں بات چیت کا رسیا پایا، نہ ان میں جوڑنے بٹورنے کا سلیقہ تھا اور نہ بعض دوسرے راہنماؤں کی طرح محفل آرا تھے۔ مولانا ابوالکلام کی طرح عوام سے کٹے رہنا بھی ان کے بس میں نہ تھا، لیکن عوام میں نشست جما کر رنگ باندھنا بھی ان کی طبیعت سے باہر تھا، وہ جس پایے کے انشا پرداز یا شاعر تھے اُس درجے کے گفتگو طراز (Conversant) نہ تھے عام مجلسوں اور محفلوں میں چُپ ہی رہتے۔ مزاج یہ تھا کہ حُقّے کی نَے سے جی بہلاتے یا انگشتِ شہادت پر انگوٹھے سے دائرے بُنتے، قلم سے حملہ آور ہوتے تو اُن کے قامت احوال پر یہ مصرع ٹھیک ٹھیک راس آتا تھا کہ ؏

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

اُن کے نزدیک گُناہ کا تصوّر ہی مفقود تھا اور یہ وثُوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ــــــ عمر مستعار کے کسی مرحلے میں بھی انہیں جوانی کو نچوڑنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ ٹُنکدے کی چوکھٹ اور میکدے کی تلچھٹ دونوں سے متنفّر تھے وہ مدرسہ سے مسجد کا مزاج لے کر نکلے تھے، اکثر راہنماؤں کی طرح انہیں تن و توش کا چسکہ مطلق نہ تھا۔ کھانے پینے کے معاملہ میں طبعاً درویش تھے، بالکل تھوڑا کھاتے، بڑی احتیاط سے کھاتے اور چند نوالوں سے زیادہ نہ کھاتے تھے، غالباً یہی وجہ تھی کہ ستر برس کی عُمر تک ان کی کمر سیدھی رہی۔ صبح کی سیر چھوٹی نہ کسرتی بدن نے دغا کی، ایک مرقع غزل کی طرح مصرع مصرع دُرست تھا۔ آخر عُمر میں کسی عطائی سے کُشتہ لے کر کھا لیا جو

اُن کے رگ و پے کی رسیاں توڑ گیا۔ پھر وہ جی نہیں رہے بلکہ موت کے انتظار میں اپنا ہی تماشا دیکھ رہے تھے۔

بعض دوستوں نے لکھا ہے کہ وہ نظم و نثر ہر حال میں لکھ لیتے تھے یعنی اس باب میں خلوت و جلوت کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ نثر کے لئے وہ ضرور تنہائی چاہتے تھے۔ یہاں انہیں قدموں کی چاپ بھی محسوس ہوتی، لیکن جہاں تک نظم کا تعلّق ہے وہ خلوت و جلوت دونوں سے بے نیاز تھے۔ ان کے لئے دوستوں کا جمگھٹا اور فضا کا سناٹا یکساں تھے۔ اُن کے لئے شعر کہنا اتنا ہی آسان تھا جیسے گھڑی اُٹھا کر وقت دیکھنا، یا آواز کی شہ پر گنگنانا جس زمانے میں مطالعہ کا شوق تھا، کتاب یا اخبار کے توجّہ طلب حصّوں پر پنسل سے خط کھینچتے چلے جاتے، ہر نیا لفظ، ہر نئی ترکیب ہر نیا خیال اور ہر نیا محاورہ اُن کے حافظے کا نقش ہوتا۔ لیکن اب ایک زمانہ سے یہ معمول ترک کر رکھا تھا اخبار ضرور غور سے پڑھتے مگر کتابوں کا مطالعہ گاہے ماہے کی چیز ہو کر رہ گیا تھا، کوئی ذاتی لائبریری نہ تھی لاہور اور کرم آباد دونوں جگہ لائبریری کا خانہ قریب قریب خالی تھا، حتیٰ کہ "زمیندار" کے فائل بھی دفتر یا گھر میں موجود نہ تھے۔ خط و کتابت کا معاملہ یہ تھا کہ نہ خود کسی کو خط لکھتے اور نہ کہیں سے کوئی خط انہیں آتا تھا یہ ایک دلچسپ قسم کا سانحہ ہے کہ کسی شخص کے پاس بھی اُن کا کوئی خط نہیں ہے۔ جن دنوں جوشؔ ملیح آبادی نے دہلی سے "کلیم" نکالنے کا قصد کیا تو پہلے شمارے کے لئے نظم طلب کی اپنے خط میں جوشؔ نے حیدر آباد سے نکالے جانے کا واقعہ بھی لکھا مجھے

یاد ہے وہ خط ایک لمبی سلپ پر تھا اور مولانا نے ہم بہت سے نوجوانوں کو پڑھ کر سُنایا تھا، انہوں نے کوئی جواب لکھا ہو، اس میں شک ہے۔ کیونکہ مولانا کی طبیعت خط و کتابت کی طرف نہیں آتی تھی۔ ان تمام بوقلمونیوں کے باوجود ہر حلقہ کے لوگوں میں اُن کا احترام یا خوف موجود تھا پیٹھ پیچھے تو ہر شخص کچھ نہ کچھ کہہ لیتا بلکہ بہت کچھ کہہ لیتا ہے مگر سامنے کہنا بڑا ہی مشکل ہوتا ہے اور مولانا کے روبرو کچھ کہنا تو بڑے جی گُردے کا کام تھا اُن کا ادب بھی تھا خوف بھی، اکثر لوگ اپنی مصلحتوں کے تابع ان کی خوشنودی کو ملحوظ رکھتے اور بظاہر بچھے جاتے تھے۔

اُن کا دست خط بڑا ہی باریک یعنی نقطوں کی طرح تھا، اس خوبی سے الفاظ و حروف سجتے تھے کہ موتی نظر آتے۔ فل سکیپ کا ایک صفحہ "زمیندار" کے تین کالم کا ہو جاتا ـــــ کسی کے کلام پر باقاعدہ اصلاح نہیں دیتے تھے، کسی نظم پر کبھی کوئی قلم لگا دیا ہو تو الگ بات ہے اصلاح کا عام طریق یہ تھا کہ اپنے ہی خیالات کا جامہ پہنا دیتے۔ زبان کی باریکیوں کو بخوبی سمجھتے تھے روزمرّہ اور محاورہ کی دقتوں میں علامہ اقبالؒ بھی اکثر آپ سے مشورہ کرتے۔ سیاسیات پر گفتگو کرنا ان کے ڈھب کی چیز نہ تھا وہ موجوں میں اُتر جاتے اور طارق کی طرح سفینے بھی جلا ڈالتے تھے مگر شناور نہ تھے۔ ادبیات میں بھی لکھنے کو بولنے پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ شاعری یا ادب کے کسی حصّے پر گفتگو نہیں کرتے تھے اور نہ کبھی تقریر میں کوئی شعر استعمال کرتے تھے شعر آ گیا تو ٹھیک ہے، ورنہ خطابت میں شاعری کے بادلے نہیں ٹانکتے تھے ـــــ حضرت!

مطلع سماعت فرمایئے، مقطع عرض کرتا ہوں، اس قسم کے لب ولہجہ سے انہیں سخت نفرت تھی، بارہا عرض کیا اپنی سوانح عمری لکھیئے، اُن لوگوں کی بابت ہی کچھ کہیئے جن کے ساتھ عمر بتائی ہے، یا پھر سر سید، شبلی، حالی، وقار الملک، محسن الملک، داغ کے متعلق کچھ کہتے آپ ان کی صحبتوں میں بیٹھے اور ان کے ساتھ محفلیں رچائی ہیں۔ آپ کی زبانِ قلم سے ہم ان کے متعلق بہت کچھ سننا چاہتے ہیں اُس زمانے کے حیدرآباد کی کہانی ہی سہی آپ کی زبانی مزہ دے سکتی ہے، سیاسی سرگذشت لکھیئے، اس سفر میں کون کون آپ کے ساتھ نہیں رہا، قید وبند کا تذکرہ فرمایئے۔ لیکن مولانا پٹھے پر ہاتھ دھرنے نہیں دیتے تھے۔ ع

واں ایک خامشی مرے سب کے جواب میں

اور اس خامشی کے لہجہ میں جیسے کہہ رہے ہوں کہ تم لوگ کس دن کے لئے ہو، پوچھو اور لکھتے رہو، لیکن ان سے پوچھنا اور جواب پانا آسان نہ تھا، بلکہ ان کی طبیعت کو اس عنوان سے آمادہ کرنا سخت مشکل تھا، وہ اس ڈھب کے انسان تھے کہ اُن سے اُن کے بارے میں بھی کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حسن اتفاق سے بعض موقر رسائل میں بعض ایسی کتابوں کا ذکر چل رہا تھا جو قید خانوں میں لکھی گئیں یا جن کے مصنف جیلخانوں میں رہے ہیں میں اُسوقت تک صرف ایک ہی دفعہ جیل گیا تھا اور وہ بھی کوئی چار ماہ کے لگ بھگ رہا ——— "قیدی کا روزنامچہ" کے زیرِ عنوان میرے دماغ میں قید کے ان دنوں کی سرگذشت لکھنے کا ایک خاکہ تھا، بہت

سوچا مگر رشتۂ تحریر ہاتھ نہ آیا، اپنی اس خفی خواہش کو جلی کرنے کے لئے میں نے مولانا سے عرض کیا کہ وہ ان تاثرات ہی کو قلم بند کر دیں جو انہوں نے جیل خانے میں فراہم کئے ہیں اس سے نہ صرف مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی بے شمار راہیں کھل جائیں گی بلکہ بعض ایسے مرحلے بھی معلوم ہو جائیں گے جو قومی جد وجہد کے آزمائشی سفر میں عموماً طے کرنے پڑتے ہیں۔ مولانا نے ہونہہ ہا نہہ کر کے ٹال دیا پھر فرمایا

"مکروہات سے کب فرصت ملتی ہے اور یہ تمام فرصت کی باتیں ہیں یہ سوال تم نے پہلی دفعہ کیا ہے، مَیں نے آج تک کبھی سوچا ہی نہیں کہ اس عنوان سے بھی کوئی سرگذشت ہو سکتی ہے۔ دماغ یکسو نہیں، قلم "زمیندار" کا ہو کر رہ گیا ہے بہرحال موضوع عمدہ ہے۔ اس عنوان پر غور کیا جائے تو ایک کام کی کتاب لکھی جا سکتی ہے؟"

"تو پھر بسم اللہ کیجئے"

مولانا مسکرائے اور جب وہ اس طرح مسکراتے تو اس کا مطلب تھا کہ ٹال گئے ہیں اب میں نے ہمّت کر کے خود ہی سوال مرتب کیا

"مولانا! یہ آپ نے جب پہلے پہل وادیٔ زندان میں قدم رکھا تھا تو کیا دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو"—— مولانا کھل کے بہت کم ہنستے تھے، قہقہہ تو غالباً ان کے ہاں تھا ہی نہیں، زیادہ سے زیادہ کھلکھلا کے ہنس دیئے، میرے اس سوال پر بہت ہنسے فرمایا،

"قید ہونا بجائے خود کوئی مقصد نہیں بلکہ سفر کا ایک پڑاؤ ہے کہ منزل تک

پہنچنے کے لیے یہاں کچھ دیر رکنا پڑتا ہے یہ ایک ایسا تجربہ بھی ہے جس سے انسان میں حوصلہ پیدا ہوتا ہے جس کسی نے قومی سیاسیات میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلی ہوں اس میں بہ استثنا۔ دو چار چیزیں ضرور پیدا ہو جاتی ہیں۔

اولاً ـــــــ اپنے نصب العین سے غایت درجہ کی شیفتگی

ثانیاً ـــــــ طبیعت میں ایک طرح کا ٹھہراؤ جو مزاج میں تلوّن پیدا ہونے سے روکتا ہے،

ثالثاً ـــــــ جرأت و جسارت کی فراوانی

رابعاً ـــــــ طبیعت میں استغنا"

عرض کیا ـــ "کیا سب لوگ قید کی سختیاں سہنے کے بعد مزاجاً ایک سے ہو جاتے ہیں"

فرمایا ـــ "نہیں میرا یہ مقصد نہیں بلکہ جو مَیں نے کہا ہے اُس کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی کا دل اگر اپنے نصب العین کے حصول کی تڑپ رکھتا ہے، اور وہ اپنی جدوجہد میں سچا ہے، تو قید و بند سونے پر سُہاگا ہیں، قرآن نے اس ابتلا کو مردِ مومن کی نشانی قرار دیا ہے، خوف اُس وقت تک خوف رہتا ہے جب تک کہ آدمی اُس سے ڈرتا رہے اور کھل کر مقابلہ میں آنے سے گریزاں ہو جب خوف ہی نہ رہا تو پھر خطرہ کیسا؟ بہرحال قید و بند نے ہمارے ہاں قومی جانبازوں کی ایک جماعت پیدا کی ہے جس کی بدولت ملک و ملت میں عزّت نفس کا احساس پیدا ہو گیا ہے"

پھر تھوڑی دیر کے لیے رُک گئے۔ ایک لحظہ توقف کے بعد فرمایا ـــ کتنی

قید کاٹی ہے؟

عرض کیا۔ مَیں ابھی تو گرفتار ہوں صرف چار ماہ کاٹی ہے اور وہ بھی بورسٹل جیل میں جہاں نوعمر قیدی رکھے جاتے ہیں اٹھارہ سال کی عمر تک ــــــ قید دو سال ہوئی تھی جرمانہ دو سو روپے عدم ادائیگی میں اور چھ ماہ، مرافعہ میں رہا ہو گیا ــــــ

"تو خیر لذّت آشنا ہو چکے ہو، یہ اب تمہاری طبیعت کے بناؤ پر ہے کہ ردِّ عمل کیا ہوتا ہے، گھبراتے تو نہیں؟

جی نہیں، آپ کی خوشہ چینی کے بعد گھبراہٹ کا تصوّر ہی بے معنی ہے ولولہ صادق ہو تو قید سے پروان چڑھتا ہے۔

دُعا کے لہجہ میں فرمایا،

"اب تم نے ایک راہ اختیار کر لی ہے، انشاء اللہ کامیاب ہو گے"۔

میں نے دیکھا کہ مولانا میرے سوال کی طرف نہیں آ رہے ہیں، لوٹ کر عرض کیا، "حضور! آپ نے جو قید کاٹی ہے، اگر اُس کی کہانی، یا کہانیاں قلمبند فرمادیں تو ہمارے لیے مشعلِ راہ ہو سکتی ہیں"۔

فرمایا: "بھئی ٹھیک کہتے ہو، لیکن ایک تو وہ زمانہ لَد چکا ہے دوسرے وہ تاثّرات اب کہاں؟ اس قسم کی چیزیں وقت ترو تازہ ہوتی ہیں، اب اگر اُن تاثّرات کو قلمبند کروں تو آمد نہیں آورد ہو گی۔ دو چیزیں اُس زمانے میں لکھی تھیں "لطائف الادب" جو تاریخی ادبی مقالات کا مجموعہ ہے سالک صاحب نے اُس

کا دیباچہ لکھا ہے۔ دوم "حبسیات"، جو اُن تمام نظموں کا مجموعہ ہے جو پانچسالہ قید کے دوران منٹگمری سنٹرل جیل میں وقتاً فوقتاً موزوں ہوتی رہی ہیں ان کے مطالعہ سے اُس زمانے کے دماغی افکار کی سرگذشت معلوم ہوسکتی ہے، مثلاً "وجدان سلیم" کے عنوان سے ایک بڑے مزے کی نظم ہے، انداز غزل کا لیکن مواد نظم کا ہے۔

بسکہ تنہائی میں تھا شوقِ غزل خوانی مجھے
کردیا قسمت نے انگریزوں کا زندانی مجھے
جو مضامیں آج تک تھے برتر از فکرِ بلند
بیٹھے بیٹھے سوجھ جاتے ہیں بآسانی مجھے
سالہا سال اتباع اسوۂ یوسف کیا!
دولتِ ایماں کی حاصل ہے فراوانی مجھے
فارغ از فکر معاش، آسودہ از رنج عیال
نعمتیں کیا کیا خدا نے کی ہیں ارزانی مجھے
راہ حق میں سر جو کٹ جاتا تو تھی اِک بات بھی
کیا تسلی دے گی یہ تھوڑی سی قربانی مجھے

جی ہاں! "حبسیات" پڑھنے سے نفسیاتی مطالعہ کی راہیں کھلتی ہیں، لیکن نفسیاتی تجزیہ بالکل دوسری چیز ہے، اور اپنی ہی زبان سے نفسیات کا اظہار ایک مختلف شے ہے یہ چیز مقابلتہً زیادہ واضح جامع اور مانع ہوتی ہے

—— فرمایا، تم نے وہ نظم دیکھی ہے:۔

پیستے ہیں جیل میں چکی اسیرانِ فرنگ
آسیائے گردشِ دوراں ہے زندانِ فرنگ

پاؤں میں بیڑی گلے میں تختی اور ہاتھوں میں داغ
اُمّتِ مرحوم پر کیا کیا ہیں احسانِ فرنگ

آسیہ کا دستہ حجت حلقۂ جولاں دلیل
اپنی منطق پر ہیں نازاں نکتہ سنجانِ فرنگ

صبح کو پالک کے ڈنٹھل شام کو اُبلے مسور
ہم رہے اس شان سے برسوں ہی مہمانِ فرنگ

ہم سیہ بختوں کو روغن بھی ملا ہو کر سیاہ
کیونکہ ہے روغن کی زردی حصّۂ خوانِ فرنگ

چھ چھٹانک آٹے میں مٹھی بھر تو ہو شملہ کی دھول
ورنہ کیا یاد آ سکے گا اندازۂ نانِ فرنگ

عرض کیا، مجھے "حبسیات" کا اسّی فی صد اور آپ کے باقی کلام کا ستر فی صد حصّہ زبانی یاد ہے۔ یہ نظم خاصی طویل ہے اور اس میں مرحوم سیاسیات کی بعض چیزیں بھی کنایتہً آگئی ہیں۔

"لیکن ایامِ اسیری پر بھی روشنی پڑتی ہے"۔

"جی ہاں! تو آپ نے کبھی چکّی بھی پیسی ہے"؟
"شوقیہ پیسی ہے، مشقّت کے طور پر نہیں ؎

محمدؐ کی شفاعت پر میری اس عرض کا حق ہے
کہ آقا تیری خاطر مَیں نے چکّی جیل میں پیسی

یہ شعر بھی انہی دنوں کی یادگار ہے، ایک صاحب ہمارے ساتھ تھے اُن سے چکّی نہیں پستی تھی کبھی کبھار اُن کا ہاتھ بٹا دیا کرتا تھا"۔

"آپ کس مشقّت پر تھے"؟

مسکراتے، "مشقّت کیا ہوتی، قید تنہائی بجائے خود بڑی مشقّت ہے پہلی دفعہ پانچ سال قید ہوئی، سارا عرصہ منٹگمری جیل میں رہا اور تنہا رہا، غالباً حکام یا احکام کی اشک شوئی کے لیے جیلر نے ٹکٹ پر لفافہ سازی یا سُوت کتائی لکھ دیا تھا، میں عموماً اپنی بارک میں باغیچہ لگاتا، یا کھیتی کرتا، ایک چھوٹی سی جگہ میں دن رات کے چوبیس ۲۴ گھنٹے بسر کرنا اور پانچسال تک اسی طرح رہنا کھیل نہیں ایک ہوشربا سانحہ تھا۔ یکساں چہرے اور وہ بھی ڈراؤنے ابسا اوقات یہ احساس ہی کاٹنے کو دَوڑتا۔ کہ مہینوں سے کوے حالانکہ منٹگمری میں کوے عام ہوتے ہیں کی آواز نہیں سنی۔ میں جس بارک میں رہتا تھا وہاں انسانی آواز کو سُنے ہوتے ہفتے گذر جاتے۔ مثلاً ایک دفعہ میں یہ سوچ کر مُسکرا دیا کہ سورج نکلتا کہاں سے اور چھپتا کس طرح ہے؟ قید مشقّت کرنے یا نہ کرنے کا نام نہیں یہ ٹھیک ہے کہ انسان وہاں اس قسم

کی مشقت میں جوتا جاتا ہے جو اس کی طبیعت کے خلاف ہوتی ہے، لیکن قید نام ہے انسان کی اپنی مرضی کے ختم ہو جانے کا، ایک قیدی کی صحیح تصویر یہ ہے کہ وہ اپنی ہر خواہش کو پٹتے دیکھتا اور حکّام کے ہاتھ میں کھلونا ہوتا ہے، مجھے یورپین کلاس کی آسانیاں میسّر تھیں اور جیل کے افسروں کا سلوک بھی مجھ سے مؤدبانہ تھا —— مگر جیل بہر حال جیل ہے، سرکاری ضابطے کے مطابق مَیں نے اپنا ایک ضابطہ بنا لیا تھا، بہت سے دن اس طرح گذرے کہ ایک ہی کوٹھڑی (CELL) میں پڑا رہا، نہ یہ معلوم ہو سکا کہ سُورج کب نکل رہا ہے اور چاند کب چمکتا ہے۔ یا کھُلی ہوا کسے کہتے ہیں اور انسانی چہرے کہاں ہیں، نہ اس کا پتہ چلا کہ باہر کی دُنیا اتنی جلدی کہاں چلی گئی ہے یا کبھی تھی بھی کہ نہیں؟ انسان جب تک کھو نہ لے پانے کا لطف ہی نہیں لے سکتا۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں جیل خانے میں بڑی بڑی ہو جاتی ہیں۔ ہم روز باغوں کے سامنے سے گزر جاتے ہیں لیکن پھُولوں کو تکتے نہیں، اور تکتے ہیں تو سرسری نگاہ سے جیل خانے میں مدّتوں حسرت ہی رہی کہ پھُول بھی کہیں کھلتے ہیں اور سبزہ بھی کہیں اُگتا ہے۔

یہ عُقدہ بھی جیل خانے ہی میں کھُلتا ہے کہ انسانی ضرُورتیں کتنی مختصر ہیں لیکن ہم لوگوں نے انہیں کتنا پھیلا رکھا ہے اور اس پھیلاؤ نے لوگوں کو کہاں تک خوار کیا ہے۔ علی گڑھ اور حیدر آباد کے بعد میرے لئے منٹگمری سنٹرل جیل بلا شبہ بلیک ہول تھا۔ عرصہ تک پڑھنا لکھنا موقوف رہا اخبار عید کا چاند ہو گیا

قلم و کاغذ مانگے تو ٹکا سا جواب ملا۔ کتابوں کی طلب و خواہش کا معاملہ بھی دو برس بعد طے ہوا، ایک طویل جد و جہد کے بعد یہ حق تسلیم کیا گیا کہ مَیں اپنے خرچ پر غیر سیاسی کتابیں منگوا سکتا ہوں لیکن وہ بھی سنسر کئے جانے کے بعد دی جا سکتی ہیں، سنسر کا یہ حال تھا کہ دو سو صفحہ کی کتاب میں ہفتوں لگ جاتے پہلے خود جیل کے حکّام دیکھتے پھر سی آئی ڈی کی نگاہیں کھنگالتیں آخر ان کی مرضی ہوتی تو ہوم سیکرٹری کے دستخطوں سے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کی منظوری آجاتی ورنہ یہ لکھا ہوا آتا کہ فلاں کتاب کے مطالعہ کی اجازت مفادِ عامہ کے منافی ہے۔

"مولانا! یہ مفادِ عامہ کیا ہے"؟

"حکومت کی خود سری! جب حکومت کوئی جرم کرتی ہے تو اس جرم کو مفادِ عامہ کے نام سے پکارتی ہے۔ ایک اور چیز ہے پریسٹیج، یہ حکام کے اختیارات کی دلہن کا جہیز ہے، وہ سب کچھ گوارا کرتی ہے مگر اس کی جدائی اُسے کسی حال میں بھی گوارا نہیں ہوتی"۔

"مولانا کبھی آپ نے بان بنا، یا مونج کوٹی ہے"؟

کبھی موقع نہیں ملا، البتہ چرخہ کاتا ہے گجرات نیشنل جیل میں گاندھی بھگتوں کے ساتھ یہی شغل تھا۔ یہ ۱۹۳۱ء کی نمکین ستیہ گرہ کے زمانے کا ذکر ہے۔ سرحد پنجاب اور دہلی کے بڑے بڑے راہنما اس خاص جیل میں رکھے گئے تھے۔ بڑا پُر رونق میلہ تھا، ہندوؤں اور مسلمانوں کے بڑے بڑے راہنما، کارکن اور افراد و اشخاص

موجود تھے مثلاً مولانا عبدالقادر قصوری، ڈاکٹر انصاری، مسٹر آصف علی، ڈاکٹر عالم ڈاکٹر ستیہ پال، مسٹر ساہنی ایڈیٹر نیشنل کال، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی۔ ڈاکٹر بھارگو، سردول سنگھ کویشر، راے زادہ ہنس راج سردار منگل سنگھ، خان عبدالغفار خاں، عبدالرحیم پوپلزئی، عارف ہسوی، شیخ حسام الدین، دیوی داس گاندھی، دیش بندھو گپتا، گیانی کرتار سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ —— جنگل میں منگل تھا، سب کو قید سخت کا حکم تھا، لیکن ظاہر ہے کہ ان میں کوئی مشقت کرنے والا نہ تھا اپنا ہی ایک دربار تھا خود انتظامی کے لیے ہم نے ایک ہائی کمانڈ بنا رکھا تھا جس نے مختلف ارکان پر مشتمل کمیٹیاں بنا دی تھیں جو مختلف امور و معاملات سرانجام دیتی تھیں کسی کے سپرد مطبخ تھا، کسی کے سپرد صفائی، کوئی ملاقاتوں پر مقرر تھا، کوئی حکام سے بات چیت کرنے پر مامور ایک طرح کا ہوسٹل تھا دانشوروں کا کلب"

جانے کیا سوجھی —— میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا

"مولانا آپ باجماعت نماز پڑھتے تھے یا اکیلے؟"

تبسم فرمایا اور کہا اکیلا بھی پڑھ لیتا تھا اور باجماعت بھی —— جماعت کے امام مفتی کفایت اللہ ہوتے یا میں خود یا پھر مولانا احمد سعید امامت فرماتے تھے"

"اس بھیڑ میں کوئی تخلیہ کا وقت بھی تھا"

کیوں نہیں تمام جیل ایک آدھ بارک کے سوا Celliner یعنی کوٹھڑیوں

پر مشتمل ہے، ہر شخص اپنی اپنی کوٹھڑی میں علیحدہ علیحدہ رہتا، دن کا اکثر حصّہ اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ کٹتا۔ احباب کے باقاعدہ حلقے بنے ہوئے تھے۔

"آپ کس حلقے میں تھے"

"تو کیا تم کچھ لکھنا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں"

تھوڑی دیر توقّف کیا، پھر ارشاد فرمایا،

"میرا حلقہ تو کوئی نہیں تھا ہر حلقے میں جا بیٹھتا اور سبھی حلقے میرے پاس چلے آتے، ہفتہ میں ایک بار مشاعرہ ہوتا، کبھی طرحی کبھی غیر طرحی، صدر مجھ کو بنایا جاتا شاعر و متشاعر سبھی حصّہ لیتے، آصف علی اچھے شعر نکال لیتے تھے، ڈاکٹر عالم نے بھی بعض غزلیں یا نظمیں کہہ لی تھیں۔ دیش بندھو گپتا نے بارہا مصرع طرح اُٹھانا چاہا لیکن عاجز ہو کر رہ گئے —— ، رائے زادہ ہنس راج نے بھی دو چار دفعہ قافیہ پیمائی کر لی۔ مفتی کفایت اللہ میں بھی شعر کہنے کا ذوق تھا —— مولانا احمد سعید اُن کا کلام سُنایا کرتے، انہیں خود دلی کی زبان پر قابو تھا اور اس رنگ میں غزل بھی کہہ لیتے تھے، ڈاکٹر ستیہ پال نے شعر کہنے کی عادت ڈالی مگر طبیعت نے فرار کیا ابناش چندر بالی نے بھی کچھ دنوں شعر کہے، بعض نوجوان شعر کہنے میں بڑے تیز تھے اور اچھی خاصی غزلیں کہہ لیتے تھے۔ بانی مشاعرہ کی ان غزلوں کو جمع کرتے رہے، رہائی کے بعد انہوں نے "پرتاپ" یا "ملاپ" میں سلسلۂ مضامین لکھا، جس میں ان

مشاعروں کی روداد شعراء کا تذکرہ اور منتخبہ کلام کی تفصیلات درج کی تھیں"

"شیخ حسام الدین بھی شعر کہتے تھے؟"

"کبھی نہیں، البتہ مشاعرہ میں باقاعدہ حصہ لیتے تھے ہفتہ میں ایک آدھ دفعہ ان کے ہاں خاص محفل ہوتی تھی۔ مولانا احمد سعید دہلوی بزم لطائف کے سرخیل اور بڑے ہی باغ و بہار انسان تھے"

"مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے بھی کبھی شعر کہے تھے"

مولانا کھلکھلا کر ہنس پڑے اور ان کا یہ نصف قہقہہ ہی مکمل جواب تھا۔ عرض کیا، "ڈاکٹر انصاری؟" فرمایا، وہ شعر تو نہیں کہتے تھے لیکن مصرعوں کو سہارا دینے میں بڑے مشاق تھے اور قدرت نے ان میں مذاق شعر کوٹ کوٹ کر بھر اتھا مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کے بارے میں فرمایا کہ وہ طبع آزمائی کرتے تھے مگر مشاعرہ نہیں پڑھتے تھے، کو کیشر کی تعریف کی کہ صاحب ذوق تھے منگل سنگھ پنجابی میں شعر نہیں کہتے بلکہ ڈنڑ پیلتے تھے، مسٹر ساہنی بھی قافیہ ردیف سمجھتے تھے اور شگفتہ مذاق پایا تھا، برج کرشن نکھرا ہوا ذوق رکھتے تھے، غزلوں میں مضمون سے قافیہ بھانپ لیتے تھے۔

"مولانا آپ نے خان عبدالغفار خاں کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا کہ وہ بھی شعر کہتے تھے یا نہیں؟"

مشاعروں میں شریک تو ہوتے تھے اور بعض شعروں پر جھومتے بھی تھے

مگر شعر کہنا ان کے بس میں نہیں تھا اپنی ہی دُنیا کے آدمی تھے، میرے ساتھ ہی ان کا (Cell) تھا، صبح کی سیر میں اکٹھے ہوتے اور بلاناغہ جیل کی چار دیواری کے گرداگرد کئی کئی پھیرے ڈالتے تھے"

"مُولانا آپ نے ان ساتھیوں کا شخصی مُطالعہ بھی تو کیا ہو گا؟"

ہاں بھائی! جیل خانہ جگہ ہی ایسی ہے کہ آدمی ایک دوسرے کو پہچانتا اور کھلتا ہے، انسانی فطرت ابتلا و آزمائش میں پُورے طور پر بے نقاب ہو جاتی ہے"

"آپ نے ان لوگوں کو کیسا پایا؟"

"تفصیل سے کچھ کہنا مشکل ہے اور نہ کسی انسان کی سیرت ہی ایک آدھ جملے میں بیان ہو سکتی ہے البتہ ساتھ رہنے سے ایک تصویر سی بنتی اور سیرت کا غالب پہلو متشکّل ہو جاتا ہے۔ انسان بجائے خود محشرِ خیال ہے، اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ انسان ایک آسان عُقدہ ہے لیکن انسان سے زیادہ مشکل کوئی چیز نہیں انسان نے بہت کچھ سَر کیا ہے لیکن جو چیز سَر نہیں ہو سکی وہ خُود اس کا اپنا وجُود ہے۔ ایک انسان جب اپنے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا تو دوسروں کے بارے میں کوئی رائے قطعی کیونکر ہو سکتی ہے، بہرحال جو خیال تمہارے دماغ میں ہے اس سے صحیح قسم کے اندازے ضرور مرتّب ہوتے ہیں۔ جیل میں ایک نہیں سینکڑوں ساتھی تھے ان میں جو نمایاں معروف یا ممتاز تھے اُن کے متعلق ذہنی تصویریں بنتی ہی رہی ہیں مثلاً آصف علی

کم آمیز تھے اور ناپ تول کر بولتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری ہر لحاظ سے بڑے آدمی تھے اُن کا وجود انصار مدینہ کے ایثار کا عکس تھا، اس حالت میں بھی ان کے ہاں سے بعض ساتھیوں کے گھروں میں ماہانہ امداد پہنچتی رہی وہ بیمار ساتھیوں پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتے اور انہیں مہنگی سے مہنگی دوا منگوا کر دیتے تھے، گوپی چند بھارگو جیتے جاگتے ہندو تھے، ستیہ پال نیشنلسٹ، منگل سنگھ اکالی، سردول سنگھ کانگریسی، عبدالغفار خدائی خدمت گار، عبدالقادر قصوری سراپا ایثار، احمد سعید طرح دار اور کفایت اللہ شب زندہ دار تھے، ڈاکٹر عالم ثریا پر اُڑتے تحت الثریٰ میں گرتے تھے، مولانا حبیب الرحمٰن سمجھ دار تھے افضل حق ذہین بھی تھے اور فطین بھی، بڑے صابر و شاکر تھے، موتی لال بڑے پایہ کے انسان تھے ہمیشہ نپی تُلی بات کہتے اور کرتے عبدالرحیم پوپلزئی غیرت کا نقش تھے، سرحد سے کچھ اور لوگ بھی ہمارے ساتھ تھے مثلاً لال بادشاہ حُریت کی تصویر تھے اور علی گل خاں شجاعت کا مجسمہ، غرض اپنے اپنے دائرے میں سبھی منفرد تھے"۔

یہاں مولانا کچھ دیر کے لیے رُک گئے جیسے اپنے حافظہ کو کُرید رہے ہیں یا کسی غائب از نظر چہرے کو ڈھونڈھ رہے ہیں — فرمایا، "سرحد کے ان لوگوں نے انگریزوں سے ٹکر لینے میں بڑی ہمت دکھائی — ان کا صوبہ سرزمینِ بے آئین تھا انہوں نے انگریزوں کا زور اس طرح توڑا کہ وہاں استعمار کا طلسم ہی ٹوٹ گیا قصہ خوانی بازار میں ان لوگوں نے جس طرح گولیاں کھائیں اور جس جوانمردی سے

بہیمانہ تشدد کا مقابلہ کیا وہ محض انہی کا حصہ تھا پشاور کو یہ سانحہ پیش آیا تو میں ان دنوں گجرات جیل میں تھا، مفتی کفایت اللہ کی صدارت میں فوراً ہی ایک جلسہ منعقد کیا گیا، فرزندانِ سرحد کے عنوان سے بر سبیلِ ارتجال ایک نظم ہو گئی،

ملک الموت کو خاطر میں نہ لانے والے　　گولیاں تانے ہوئے سینوں پہ کھانے والے
قبر تک جبر کو سہتے ہوتے جانے والے　　صبر کا معجزہ دنیا کو دکھانے والے
رنگِ اسلام کا محفل میں جمانے والے　　اپنے ہی خون شہادت میں نہانے والے
اپنے اقبال کا نقارہ بجانے والے　　ناچ طاغوت کو نگنی کا نچانے والے
دل کی بستی کو محبت سے بسانے والے　　شیخ کا جوڑ برہمن سے ملانے والے
ہندوؤں کیلئے گھر بار لٹانے والے　　شانِ ایثار زمانہ کو دکھانے والے
کشورِ ہند کو آزاد کرانے والے　　نام مشرق سے غلامی کا مٹانے والے
جانتے بھی ہو کہ کس خاک سے اٹھی ہے یہ قوم　　جس کے گن گاتے ہیں اور گائیں گے گانے والے
فخر ہے صوبۂ سرحد کو کہ اس کے فرتے　　ہیں خمیر اس کی شجاعت کا اٹھانے والے

دنگ ہیں دیکھ کے اس قوم کے یہ رنگ یہ ڈھنگ
نارمن، بولٹن اور ان کے گھرانے والے

مولانا! آپ نے کل کتنی قید کاٹی ہے اور کئے دفعہ قید یا نظر بند ہوتے ہیں؟
مولانا نے اس سوال کا نوٹس ہی نہ لیا سرحد کے المیہ کا ذکر کرتے رہے فرمایا حبیب نور ایک قبائلی نوجوان تھا، جس نے قصہ خوانی فائرنگ کے افسر مجاز

کو مار ڈالا اُسی روز مقدمہ سُنا گیا اور دو گھنٹے کی سماعت کے بعد اُس کو ایک گھنٹہ کے اندر اندر ہمیشہ کی نیند سُلا دیا گیا۔ حبیب نور کو چونے کی ایک بھٹّی میں بٹھا کر چُونے ہی کے ڈھکنے سے ڈھکا گیا پھر اُوپر سے اُبلتا ہوا گرم پانی ڈال کر بھسم کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے ہر جگہ کے مہذب لوگوں کو لرزا دیا سارا ملک اس سے کانپ اُٹھا۔ اسی جانگداز واقعہ پر اس نظم میں اشارات ہیں ؎

تجھے کیا بتاؤں میں ہم نشیں مرے غم کا قصّہ طویل ہے
وطنِ عزیز ذلیل ہے ہوا غیر جب سے دخیل ہے
ہیں نئی روش کی عدالتیں ہیں نرالے ڈھنگ کے فیصلے
نہ نظیر ہے نہ دلیل ہے نہ وکیل ہے نہ اپیل ہے

فرمایا، سرحد کے لوگوں پر انگریزوں نے بڑے ظلم ڈھاتے ہیں اکثر رضاکاروں کو گولی سے اُڑا دیا بعض کے خصتین کھینچ لئے بعض کو اس بُری طرح زدوکوب کیا کہ ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو کر رہ گئے"

مَیں نے اپنے سوال کا اعادہ کیا، "کَے دفعہ آپ نے قید کاٹی اور نظر بند ہوتے؟ اور یہ کل کتنی مدّت ہوتی ہے؟"

فرمایا، دن تو گِنے نہیں، لیکن نظر بندی اور قید کے دن مِلا کر کوئی چودہ ۱۴ سال ہو جاتے ہیں اور اگر ان میں ضبطیاں اور قرقیاں ملائی جائیں تو پھر آج تک آدھی عمر اسی کوچہ میں کٹی ہے، پہلے ۱۹۱۴ء میں نظر بند ہوا تھا اور تا اختتام جنگ اپنے

گاؤں کرم آباد میں نظر بند رہا، پانچ برس بعد رہا ہوا تو وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔" ۱۶ دسمبر ۱۹۲۰ء کو حضور کی ایک تقریر کے "جُرم" میں دھر لیا گیا، دو مختلف دفعات میں پانچ اور دو برس قید کی سزائیں ہوئیں جو ایک ساتھ شروع ہوتی تھیں۔ پانچ سال کاٹ کے رہا ہوا تو کچھ عرصہ آزاد رہا۔ مگر اس اثنا میں بھی ایک دو ماہ کے لیے اندر جانا پڑا، ۱۹۳۰ء میں کانگرس نے سول نافرمانی شروع کی، تو جالندھر سے گرفتار کر کے لاہور لایا گیا، یہاں مقدّمہ چلا تین سال قید کی سزا ہو گئی۔ گاندھی ارون میثاق میں ڈیڑھ برس بعد رہا ہو گیا تھوڑے ہی دنوں بعد پھر ایک ماہ کے لیے اندر جانا پڑا۔ شہید گنج کی تحریک میں قریب قریب ڈیڑھ سال کرم آباد میں نظر بند رہا، یہ نظم اسی کا اظہار ہے۔

حق کے اظہار کی پاداش میں انگریزوں نے — کرم آباد میں پھر مجھ کو نظر بند کیا
جُرم یہ تھا کہ مساجد کی نگہبانی کو — مَیں نے کیوں تابعِ آئینِ خداوند کیا
کاش دیتے وہ سزا مجھ کو بہ اندازۂ جرم — جسم سے قطع نہ کیوں رُوح کا پیوند کیا

بخش سکتی ہو اسیری مری جن کو خوشیاں
للہ الحمد کہ میں نے انھیں خورسند کیا

عرض کیا — قید کے دن تو کافی تھے بالخصوص منٹگمری کے ایام تنہائی پانچ سال کا عرصہ تھوڑا نہیں ہوتا اور کرم آباد کی نظر بندی کے دن بھی تھوڑے نہیں تھے اگر ان دنوں آپ قلم کو مشغول رکھتے تو ادب کو خاصا فائدہ پہنچتا۔

فرمایا، ـــ غلبۂ رومؔ[1] بھی تو قید ہی کے دنوں کی یادگار ہے۔

مولانا سے ملنا ملانا مشکل نہ تھا اُن سے کچھ پُوچھنا مشکل تھا اس قسم کے انٹرویو اکیلے میں کئے جاتے ہیں۔ مولانا عموماً عقیدت مندوں میں گھرے رہتے گھر میں ہوتے تو ارادت مندوں کا ہجوم رہتا، گھر سے نکلتے تو سفر لمبا ہو جاتا، مثلاً شہید گنج کی تحریک کو لے کر نکلے، تو ہندوستان بھر کا چکر کاٹا، حتّٰی کہ برما پہنچ گئے اور وہاں صُوبہ بھر کا دَورہ کیا، مَیں اس سفر میں کلکتہ تک اُن کے ساتھ رہا، درمیان میں ایک دفعہ لاہور آ گیا دوبارہ یاد فرمایا تو پٹنہ میں ان سے جا ملا۔ اثنائے سفر میں اس کہانی کو چھیڑتا رہا جس سے یہ اوراق حافظہ میں آتے گئے ـــ سوال کیا

"مُولانا، جب پہلے پہل آپ گرفتار ہوتے تو آپ نے کیا محسوس کیا؟"

"مُحسوس کیا ہوتا؟ میرے علم میں تھا کہ یہ ہو کر رہے گا اور وہی ہو کر رہا۔"

"تاہم آپ نے محسوس کیا کیا؟"

ایک ادنیٰ اسا اضطراب پیدا ہو کر ختم ہو گیا۔ زیادہ سے زیادہ آنکھ کی جھپکی کا وقفہ ہو گا۔ مَیں نے دل کو ٹٹولا تو یقین ہو گیا کہ وہ اس کے لئے بالکل تیار ہے،

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مولانا ظفر علی خاں کا قید ہونا اس لحاظ سے غنیمت ہے کہ قید سے چھوٹتے ہی وہ اہل ذوق کے لئے کوئی نہ کوئی علمی تحفے لے آتے ہیں۔

جب تک قدم نہ اٹھیں آزمائش کی راہ بھیانک نظر آتی ہے، جونہی قدم اٹھتے ہیں تمام خوف مدھم پڑ جاتے ہیں۔[1]

---

[1] عبدالمجید سالک نے "سرگزشت" میں لکھا ہے غالباً مئی ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے کہ ایبٹ آباد میں ایک فوجی گورے جلکوٹ نے ایک مہاجر حبیب اللہ خاں کو بندوق سے شہید کر دیا اس پر بڑا ہنگامہ ہوا، اگست میں کلکتہ میں کانگرس کا خاص اجلاس ہوا۔ جس میں پنجاب سے دوسرے لوگوں کے علاوہ مولانا ظفر علیخاں، آغا محمد صفدر اور ڈاکٹر کچلو بھی گئے تھے۔ ۵ اگست ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے مولانا ظفر علی خاں کا تار آیا کہ میں ۱۵ کی دوپہر کو لاہور اسٹیشن سے گذر رہا ہوں مجھ سے ملنے کے لئے آؤ اختر علی خاں اور مَیں ریلوے اسٹیشن پر گئے تو کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ حسب معمول ریلوے اسٹیشن کے تمام کاروبار چل رہے تھے۔ ہم پلیٹ فارم ۵ پر پہنچے، ٹرین آئی مولانا، آغا صاحب اور ڈاکٹر صاحب اترے، بغل گیر ہوتے، اسی رات عزیزم منصور علی خاں پیدا ہوتے تھے، مَیں نے مولانا کو یہ خبر سنائی اور انہیں پوتے کی ولادت پر مبارک باد دی، مولانا نے بتایا کہ ہم گاندھی جی کے حکم سے ایبٹ آباد جا رہے ہیں جہاں پر جلکوٹ کا کورٹ مارشل ہو رہا ہے۔ ہم اس کورٹ مارشل کا مشاہدہ کریں گے کہ آیا انصاف کا منشا پورا ہو رہا ہے یا نہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک طرف مسٹر براؤن انسپکٹر پولیس کھڑے ہیں اور وردی پہنے ہوتے نہیں ہیں۔ علیک سلیک ہوئی، براؤن نے اشارے سے

آپ نے جیل میں پہلا دن اور پہلی رات کیونکر کاٹی ؟"
بس کٹ گئی ، مجھے لاہور ریلوے اسٹیشن سے گرفتار کر کے سیدھا سنٹرل جیل

مجھے بلایا، اور کہا "مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں قانون تحفظ ہند کے تحت مولوی ظفر علی خاں کو گرفتار کرنے آیا ہوں آپ مولوی صاحب کو اطلاع دے دیجئے"۔ یہ سن کر میرے تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی ، جھٹ مولانا کے پاس پہنچا اور اُن کو یہ خبر سنائی مولانا ہنس کر اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے لگے اور قلم ، بٹوا ، پنسل وغیرہ نکال کر اختر علی خاں کے حوالے کیں کہ "اب مجھے ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے ، میں تو اب سرکار کا مہمان ہو گیا"۔ مولوی صاحب کا سامان اُتار لیا گیا ، ڈاکٹر کچلو اور آغا صفدر بھی بہت پریشان ہوتے ، لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات براؤن نے مولوی صاحب کو ساتھ لیا ہم پیچھے پیچھے روانہ ہوئے ۔ جب نمبر ۲ پلیٹ فارم سے سیڑھیاں چڑھنے لگے تو سارا اسٹیشن پولیس سے بھرا ہوا تھا ۔ انسپکٹروں ، سب انسپکٹروں اور کانسٹیبلوں کا کوئی شمار نہ تھا اور عام مسافر حیران تھے کہ یہ کیا آفت ہے کوئی بڑا ہی خطرناک ڈاکو گرفتار ہو رہا ہوگا ، ڈیوڑھی میں پہنچے تو ایک موٹر کار کھڑی تھی ۔ براؤن اور مولوی صاحب اس میں بیٹھ کر چل دیئے ۔ میں نے اختر علی خاں سے کہا فوراً ٹیکسی لو اور اس موٹر کار کے پیچھے ڈال دو ، ورنہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ مولوی صاحب کو کہاں لے گئے ہیں ۔ اختر علی خان ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوا ہو گئے اور میں تانگے میں دفتر پہنچا ، تاکہ مولانا کی گرفتاری کی خبر کے متعلق ضمیمہ شائع کرنے کا انتظام کروں ضمیمہ نکلا اور ہزاروں

لے گئے ـــــــ وہاں کتنی دیواروں، کتنی دروازوں اور کتنی تالوں میں گھری اور جکڑی ہوئی (Cell) چکی میں بند کر دیا گیا کوئی ہفتہ بھر اسی طرح بند رہا، سورج دیکھا

کی تعداد میں فروخت ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اختر علی خاں واپس آئے اور بتایا کہ مولانا کو سنٹرل جیل میں لے گئے ہیں اب میں لیٹین (ملازم) کے ہاتھ بستر وغیرہ بھیج دیتا ہوں۔ مولانا کی بے وقت گرفتاری سے مجھے بہت صدمہ ہوا۔ خیال تھا کہ وہ اس تحریک میں چند مہینے زور شور سے کام کریں گے تو بڑا فائدہ پہنچے گا۔ لیکن حکام کو مولانا کی شعلہ بیانی کا بارہا تجربہ ہو چکا تھا انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ مولانا کو مرحلۂ اول ہی پر قید کر دیا جائے، بعد میں معلوم ہوا کہ مسٹر مچل (جو بعد میں کمشنر ہو گئے تھے) کی عدالت میں مولانا پر مقدمہ چلایا جائے گا اور بنائے مقدمہ وہ تقریر ہے جو مولانا نے دو ماہ قبل حضرو ضلع اٹک میں کی تھی اور جہاں مولانا کا دو میل لمبا جلوس نکالا گیا تھا، اس زمانے کا طریقہ یہ تھا کہ استغاثہ تو اپنے گواہ وغیرہ پیش کرتا تھا لیکن دفاع نہیں کیا جاتا تھا مولانا نے صاف کہہ دیا کہ میں ایک مختصر سا بیان داخل کروں گا، نہ میری طرف سے کوئی وکیل ہے نہ گواہ، قصہ کوتاہ یہ کہ مولانا ظفر علی خاں کو پانچ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی اور منٹگمری سنٹرل جیل میں ان کا نشیمن مقرر کیا گیا، جہاں میں اور اختر علی خاں بارہا جا کر ان سے ملاقاتیں کرتے رہے۔

ادب و شعر کی مصروفیتیں ختم ہو چکی تھیں امتیاز نے میرے چلے آنے کے بعد کہکشاں بند کر دیا اوّل اس لئے کہ میں دارالاشاعت سے چلا آیا دوم اس لئے کہ یہ رسالہ ان کی تعلیم میں حارج ہو رہا تھا سوم اس لئے کہ اس میں مسلسل خسارہ ہو رہا تھا مجھے

نہ چاند، ایک سیاہ خانہ تھا مقدمہ شروع ہوا باہر آیا تو محسوس کیا کہ آزادی کے چھن جانے کا نام ہی قید ہے ـــــــ تنہائی میں ـــــــ انسان کی جیسی دماغی حالت

اب سیاست وصحافت کے سوا کسی اور بات کا ہوش نہ تھا جیل خانہ سامنے نظر آرہا تھا، اس لئے فرصت کو غنیمت جان کر ترک موالات کو کامیاب بنانے کے لئے دل وجان سے مصروف کار تھا۔

مولانا ظفر علی خاں کے تین چار ماہ بعد اختر علی خاں بھی گرفتار کر لئے گئے، کیوں کہ حکام نے انہیں ایڈیٹر" زمیندار" قرار دے دیا، مَیں نے اپنی شہادت میں کہہ ہی دیا کہ اختر علی خاں کو ایڈیٹری سے کوئی تعلق نہیں، لکھنے والا تو میں ہوں۔ لیکن قانون نے تسلیم نہ کیا اور اختر علی تین سال کے لیے مرتبۂ اسیری پر فائز ہو کر سنٹرل جیل میں بھیج دیئے گئے، جہاں پانی پت کے صوفی اقبال مرحوم، مولانا لقاء اللہ عثمانی اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری پہلے سے موجود تھے۔

ہاں خوب یاد آیا، مولانا ظفر علی خاں کے رشتے کے ایک چچا راجہ غلام قادر اس زمانے میں" زمیندار" کے پبلشر تھے وہ بھی مولانا اختر علی خاں کے ساتھ ہی ٹانک دیئے گئے، بوڑھے آدمی مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت مجاہدین حریت میں شامل ہو کر جیل خانے میں براجمان ہو گئے۔ اللہ مغفرت کرے عجب دلچسپ بزرگ تھے۔

مولانا ظفر علی خاں کی گرفتاری کے بعد" ترک موالات" کی تحریک تیز ہو گئی۔ کانگرس

ہوتی ہے اُسی طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں، اس حال میں ماضی بہت
تیزی سے انسان کے سامنے آتا ہے، تصویروں پہ تصویریں گذرتی چلی جاتی

مجلس مرکزیہ خلافت اور جمعیۃ العلمائے ہند کے لیڈروں اور کارکنوں نے ملک بھر کے دَورے شروع کر دیئے۔ مولوی صاحب کی گرفتاری پر احتجاج کرنے کے لئے باغ بیرون دہلی دروازہ میں ایک جلسہ ہوا، جس میں دوسرے بزرگوں کے علاوہ سوامی پرکاشانند اور سوامی ستیہ دیو نے بھی ہنگامہ خیز تقریریں کیں۔ سوامی پرکاشانند نہایت صاف سُتھری اور بامحاورہ اُردو بولتے تھے اور طرزِ تقریر بھی دلکش تھا، دوسرے سنیاسی ستیہ دیو بھی گیروے کپڑے پہنتے تھے، بھاری جسم، بھرا ہوا چہرہ، چار ابرُوؤں کا صفایا نہایت گرجدار آواز، ایم اے بھی تھے اور یورپ اور امریکہ کا سفر بھی کر چکے تھے۔ یہ مجھے خاص طور پر اس لئے یاد ہیں کہ اُن کی تقریر کی ایک خصوصیت ایسی تھی جس کی نظیر کم از کم مجھے اب تک نظر نہیں آتی، وہ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں بیک وقت تقریر کرتے تھے اور لُطف یہ ہے کہ اس کا کوئی فقرہ سماعت کو ناگوار نہ ہوتا تھا، مثلاً

حضرات، سجنو، اس ہندوستان کے اندر، اس بھارت ورش کے اندر سوتنترا کا بھاؤ دیکھ کر، آزادی کی خواہش دیکھ کر میرا ہردے بہت پرسن ہو رہا ہے، میرا دل بے حد خوش ہو رہا ہے“۔

یہ کمال صرف چند فقروں ہی تک محدود نہ تھا، بلکہ سوامی جی نے پون گھنٹے تقریر

ہیں، ایک کے بعد دوسری تصویر آتی اور نکل جاتی ہے یہ ایک عجیب سا منظر ہوتا ہے، مَیں بھی قید کی پہلی رات سے لے کر مقدمہ کی سویر تک بہت سی تصویریں

کی، اور شروع سے آخر تک "دوزبانی" کے اس التزام کو نباہ دیا، چند روز کے بعد گاندھی جی آئے، بہت عظیم الشان جلسہ ہوا، گاندھی جی جلسہ شروع ہونے سے پہلے دفتر "زمیندار" میں تشریف لائے، وہ بعض خلافتی رہنماؤں سے گفتگو میں مصروف تھے اور میں چیکوٹ گورے اور حبیب اللہ خاں مہاجر شہید کے متعلق کاغذات لیئے گاندھی جی کے سر پر کھڑا تھا، بڑی مشکل سے جب وہ فارغ ہوئے تو مَیں نے سارا معاملہ انہیں سمجھایا کہ کس طرح گورے نے حبیب اللہ خاں کے جذبۂ دینی کا مضحکہ اڑایا، کس طرح مہاجر نے اس گورے کو دندان شکن جواب دیا جس پر گورے نے غصّے میں آکر اس کو شہید کر دیا۔ گاندھی جی نے تمام تفصیلات توجہ سے سُنیں، اور مجھے اس کے متعلق یادداشت مرتب کرنے کا حکم دیا۔

اتنے میں ہزارہا حاضرین جلسہ تکلیف انتظار سے مضطرب ہو کر دفتر "زمیندار" کے سامنے سڑک پر جمع ہو گئے اور فلک شگاف نعرے لگانے لگے، مہاتما گاندھی کی جے، ہندوستان کی جے، ہندو مسلمان کی جے، بندے ماترم، اللہ اکبر، ست سری اکال، آخر گاندھی جی اُٹھے اور جلسے میں شامل ہونے کے لئے چلے۔ رضاکاروں نے ہجوم میں سے راستہ نکالا گاندھی جی جلسہ گاہ پہنچے تو جوش وخروش کی انتہا نہ تھی۔ پہلے دوسرے لیڈروں نے تقریریں کیں، اس کے بعد گاندھی جی نے جلسہ کو خطاب کیا، اور مولانا ظفر علی خاں کی

دیکھتا رہا، اور تصویریں تھیں کہ گذرتی چلی جا رہی تھیں، سب سے زیادہ مجھے علی گڑھ کے ہوسٹل کا زمانہ یاد آیا، کیا زمانہ تھا اور کیا ساتھی پھر بمبئی کی یاد آئی۔ خصوصیت سے اپالو اور چوپاٹی کی یاد، پھر حیدر آباد چلا گیا، کہاں آصف جاہ کا دربار میر عثمان علی کی اتالیقی، اُن کی فرمانروائی اور کہاں جیل خانے کی سنگین و سیاہ راتیں طبیعت جھنجلاتی ـــــ مگر صاف نظر آ رہا تھا کہ یہی وہ راستہ ہے جو ہندوستان کی آزادی کو جاتا ہے، دل اس سے مطمئن بھی تھا اور مسرور بھی"۔

"مولانا آپ نے پہلے ہی دن (Cell) چکی میں بند ہو کر شعر بھی کہے تھے" فرمایا ـــــ ہاں کالی کوٹھڑی تھی، انگریز کے ضمیر کی طرح سیاہ اور ہندو کے دل کی طرح تنگ (یہ مولانا کا مخصوص انداز تھا) رات جب مچھروں نے کاٹا اور "سب اچھا" کی آواز نے جگا دیا تو میں اُٹھ کر ٹہلنے لگا، دل بھر آیا اشعار ہوتے گئے جو حافظہ میں رہ گئے وہ زمیندار میں چھپ گئے اور اب "بہارستان" میں محفوظ ہیں ـــــ مولانا نے ـــــ حسرتؔ کے مقدمہ کی تفصیلات بیان کیں کہ اس میں کیا ہوتا رہا، فرمایا پنجاب کے شمال مغربی اضلاع میں انگریزی حکومت سے

گرفتاری پر احتجاج کرتے ہوئے وہ فقرہ کہا جو یار لوگوں کی محفلوں میں مدت تک سرمایۂ قہقہہ بنا رہا۔

"مولوی جبھرالی کہاں اپنا پھرج بجا گئے، اب تم سب بھائی بہن اپنا اپنا پھرج بجاؤ"۔

وفاداری بڑی پختہ ہے، یہاں کے لوگ ہمیشہ حکومتوں کے وفادار رہے ہیں وہ قومی یا سیاسی تحریکوں میں حصّہ لینے کے عادی نہیں، انگریزوں نے بہمہ وجوہ انہیں ایسے لوگوں کے نرغے میں دے رکھا ہے جو انہیں آزادیٔ فکر کے نشوونما پانے کا موقع ہی نہیں دیتے یہ اپنی طبیعت کے لوگ ہیں اور ان کا خمیر وضمیر ہی سرکار کی مٹی میں گندھا ہوا ہے —— اس مقدمہ میں میرے خلاف چودہ گواہ تھے جن میں صرف دو ہندو تھے ایک لالہ بالمکند دوسرے سوامی پرکاشانند باقی تمام بفضل تعالیٰ مسلمان تھے۔ مسلمانوں میں حضرت پیر سیّد مہر علی شاہؒ نے استغاثہ کا گواہ بننے سے انکار کر دیا، دونو ہندو بھی انکار کر گئے، باقی تمام گواہوں نے اللہ کو گواہ بنا کر جھوٹ بولا، جن میں آنریبل ملک محمد امین شمس آبادی، سردار دوست محمد خاں فتح جنگ اور تین سیّد تھے۔ مَیں نے یہ تقریر ۱۴ اگست ۱۹۲۰ء کو حضرو میں کی تھی ۱۶ دسمبر کو مجھے گرفتار کیا گیا، ۲۵ دسمبر کو مقدمہ کی سماعت کا پہلا دن تھا۔ مسٹر مجل جو بعد میں فنانشل کمشنر ہو گئے، اسی غرض ہی سے سپیشل مجسٹریٹ مقرر کئے گئے ۱۲۴ الف ۱۲۲ الف اور ۱۵۳ الف کے تحت تین مقدمات قائم کئے گئے میرے الفاظ تو خیر رپورٹر کی ادبی بے مائیگی کے باعث ضائع ہو گئے لیکن مَیں نے اس تقریر میں جو باتیں کہی تھیں ان کا مفہوم کسی قدر باقی تھا اور وہ باتیں یہ تھیں

ہمیں وہ مسلمان ہیں جنہوں نے مکّہ معظمہ میں آگ لگائی غلافِ کعبہ جلایا اور صرف دس یا گیارہ روپے کی خاطر مسلمانوں کا قتل عام کیا۔

(۲) پرنس آف ویلز آرہے ہیں حکومت چاہتی ہے ہم اُن کا خیر مقدم کریں تو
اُس پر لازم آتا ہے کہ

(الف) تحریک خلافت میں مداخلت نہ کرے،

(ب) مقاماتِ مقدسہ کو خالی کردے اور ترکوں سے انصاف برتے

(ج) مارشل لاء کا دوبارہ نفاذ نہ کیا جائے۔

(د) رولٹ ایکٹ منسوخ کیا جائے،

(ہ) مُسلمانوں سے جو وعدے کئے گئے تھے وہ پُورے کئے جائیں ورنہ
وعدہ شکن انسانوں کی حکومت کا بچنا محال ہے۔

استغاثہ کا میرے خلاف الزام یہ تھا کہ میں نے برطانوی سرکار کے خلاف عامۃ النّاس کو بغاوت پر اُکساتے ہوئے کہا کہ

(۱) بغداد پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزی فوجوں نے دوشیزاؤں کی عصمت پر
حملہ کیا اور انتہائی جانگداز مظالم کئے

(۲) ہم معاہدہ ترکی کو حقیر ترین پُرزہ کاغذ سمجھتے اور پامال کرنے کا تہیہ کرچکے ہیں

(۳) مُسلمانوں پر ہجرت فرض ہوگئی ہے

(۴) سرکاری مدرسوں کا مقاطعہ کیا جائے

(۵) کوئی شخص فوج میں بھرتی نہ ہو۔

(۶) ذیلدار اور نمبردار سرکاری خدمات سے سبکدوش ہوجائیں عام سرکاری ملازم

نوکری چھوڑ دیں، اور اگر کوئی اس سے انحراف کرے تو اُسے مُسلمانوں کی صف میں سے نکال دیا جائے کیونکہ اُس پر کُفر وارد ہو جاتا ہے

(۷) ہندوستان دارالحرب ہے کیونکہ یہاں مذہبی آزادی سلب کر لی گئی ہے۔

(۸) ایک شخص برطانوی فوج میں ترکوں کے خلاف لڑ رہا تھا بغداد کے مورچہ پر مارا گیا، باپ لاش لینے گیا تو بیٹے کا مُنہ سؤر کا سا ہو گیا تھا۔

(۹) برطانوی حکومت تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے ہم ہرگز ہرگز بھرتی نہیں دیں گے۔

۲۷ دسمبر کو مجسٹریٹ نے سرکاری گواہوں کے بیانات قلمبند کرنے کے بعد اپنا فیصلہ سُنا دیا مولانا کو ۱۵۳ الف اور ۱۲۴ کے تحت مجرم قرار دیتے ہوئے دو اور پانچ سال قید کا حکم دیا۔

"مولانا آپ نے قولِ فیصل کی طرح کا کوئی تاریخی تحریری بیان بھی دیا تھا؟"

ہاں میں نے اپنے خلاف عائد کردہ الزامات کی تصریح میں ایک بیان دیا تھا جس میں اپنے موقف کی صداقت کا اظہار و اقرار تھا۔ میں نے عدالت سے کہا کہ جو کچھ میں نے برطانوی حکومت کے خلاف کہا ہے وہ اپنی غلامی کے خلاف احتجاج ہے، یا خلافت کے بارے میں جو پالیسی حکومتِ برطانیہ نے اختیار کی ہے، اس پر اظہارِ تاسف کیا گیا ہے، کیونکہ ہم اپنی رسوائی کی بنا پر حکومت

سے تعاون کرنا قومی جرم سمجھتے ہیں"

مُولانا! جب آپ کو اتنی بڑی سزا سنائی گئی اُس وقت آپنے کیا محسوس کیا؟"

مولانا مُسکرائے، ہم اس وقت سفر میں ہوڑہ اسٹیشن کے لگ بھگ تھے،

فرمایا معلوم ہوتا ہے نفسیات کے طالب علم بننے کی کوشش کر رہے ہو، بھئی اس قسم کے حادثے سانحے، ایسے دیر پا نہیں ہوتے، اپنا ایک فوری تاثر پیدا کرتے اور دیکھتی آنکھوں ختم ہو جاتے ہیں۔

قید ہونا یا نظر بند ہونا ابتلا ضرور ہے اور نہ ہر شخص قومی مقاصد کے لئے قید کاٹ سکتا ہے یاد ہوگا مَیں نے تمہیں کہا تھا کہ یہ بڑے جی گُردے کا کام ہے اور وہی لوگ اس امتحان میں پُورا اُتر سکتے ہیں جو دل سے فیصلہ کرلیں کہ موت و حیات کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہا۔ وہ دن اب کہاں لَوٹتے ہیں۔ ایک سفر تھا پُورا ہوگیا افسوس اس کا نہیں کہ ہم پر یہ سانحہ بھی بیت چُکا ہے، خلش یہ ہے کہ وہ دن بسرعت تمام ہَوا ہوگئے، اب ان کی ایک ناتمام سی یاد باقی ہے کس محبت سے ہم لوگ اکٹھے ہوتے تھے اور کس حسرت سے ہمارا شیرازۂ اتحاد منتشر ہوگیا! اور اب تو اس عہد کی باتیں ہی خواب و خیال ہوگئی ہیں۔

عرض کیا"، کبھی آپ نے بیڑیاں بھی پہنی ہیں؟"

فرمایا"، نہیں! ہتھکڑیاں پہنی ہیں، یہ سب قید کے حاشئے ہیں، اصل متن قید ہی ہے ——— !"

"گجرات جیل میں تو ایک شہر آباد تھا بھلا وہاں دل کیونکر اُچاٹ ہوتا؟ اصل قید منٹگمری سنٹرل جیل کی ہوگی، جہاں آپ نے تن تنہا پانچ سال گذارے وہاں کیا سوچا کرتے تھے آپ؟ اتنی مدت آپ کا جی کیونکر لگا رہا؟"

"الفاظ کے ہیر پھیر سے سوال کر رہے ہو، مَیں کہہ چکا ہوں کہ قید میں جی لگا نہیں کرتا لگایا جاتا ہے، مَیں منٹگمری جیل میں تین جگہ رہا۔ سب سے پہلے مجھے چھ چکی (Six Cells) میں رکھا گیا، وہاں سے آٹھویں بارک کے عقب میں ڈالا گیا جس کا صحن دُگنا تھا لیکن کمرہ عام (Cell) کی طرح کا تھا، ایک طرف چھوٹا سا کچن پہلو میں اتنا ہی غسل خانہ تیسری جگہ مین گیٹ کے پاس ایک چھوٹا سا بلاک تھا جہاں مَیں قید کے آخری دنوں میں رہا، دن کٹ جاتے ہیں اور کٹ گئے، کبھی اپنے ہی نفس پر سوچتا کبھی گرد و پیش پر اور کبھی اُن ملکی واقعات پر جو اُمڈتے اور اُڑتے چلے آ رہے تھے۔ مَیں سنِ شعور ہی سے تڑکے اُٹھنے اور گھنٹہ دو گھنٹہ ٹہلنے کا عادی ہوں جیل میں بھی یہی التزام رہا۔ گو وہاں اُٹھا نہیں اُٹھایا جاتا ہے، فرق یہ پڑا کہ باہر کھلی فضا میں پانچ چھ میل ٹہل آتا تھا جیل میں بار بار اپنے ہی احاطہ کا چکر کاٹنا پڑا وہاں ایک ہی دائرے کے اندر گھومنے کا پیچ تھا جس طرح گھڑی کی سوئیاں گھومتی ہیں اسی طرح میں صبح سویرے گھومتا نماز پڑھتا قرآن پاک کی تلاوت کرتا قرآن مجید حفظ کرنے کا قصد بھی کیا اور پانچ پارے یاد بھی ہو گئے۔ کوئی سال بھر اخبارات سے محروم رہا پھر عبدالغفور جیلر کی مہربانی سے "زمیندار" اور دوسرے اخبار

ملنے لگے، کتابیں بھی آہستہ آہستہ آتی گئیں، لکھا پڑھی کا سامان عرصہ دراز تک موقوف رہا اور جب ملا تو قید کے دن تھوڑے سے رہ گئے تھے۔ "لطائف الادب" انہی دنوں کی یادگار ہے۔ مَیں نے اکثر کلام پاک کو زیر مطالعہ رکھا اور اسی پر غور کیا نتیجۃً مجھے اسلام سے دیوانگی کی حد تک عشق ہو گیا مَیں سمجھتا ہوں جو فائدہ اُس قید نے مجھے پہنچایا وہ قرآن کا مسلسل مطالعہ اور اس مطالعہ کا حاصل یعنی اسلام سے والہانہ عشق ہے۔ "غلبہ رومؔ" میرے اسی لگاؤ کا نتیجہ ہے، غالبؔ کا فارسی دیوان بھی دوبارہ دیکھا، ملک میں فارسی زبان کی گمشدگی کے باعث لوگوں نے غالبؔ کے اس مجموعہ کو نگاہ میں نہیں رکھا، ورنہ فارسی کے مقابلہ میں اس کا اُردو کلام وہی درجہ رکھتا ہے جو غالبؔ کے مقابلہ میں ذوقؔ کا ہے، مثلاً غالبؔ کا یہ شعر ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل!
قانونِ باغبانئ صحرا نوشتہ ایم

مہینوں گنگنایا ہے اور قید میں تو اس سے پیچھا ہی نہیں چھُوٹتا تھا۔ جب بھی گنگناتا، معانی و مطالب کی نئی نئی راہیں کھُلتی تھیں۔

پھر غالبؔ کی قید کا ذکر چھیڑ دیا، فرمایا یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ قید نے غالبؔ کی شاعری کو چمکایا، لیکن قید کے بعد کی غزلوں میں ایک خاص قسم کی چمک ضرور پائی جاتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اپنی عزتِ نفس کے مجروح ہونے کا قوی احساس تھا۔ لیکن اس سے یہ کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا کہ قید ہونے سے شاعری چمک

اٹھتی ہے" مَیں نے عرض کیا۔

فرمایا کلیتہً کا سوال نہیں بہرحال شاعر کے واردات قلب اس سے ضرور متاثر ہوتے ہیں اور غالبؔ جیسا نابغہ وعبقری اس سے کیونکر مستثنیٰ ہو سکتا ہے"

غالبؔ کے ہاں جو کسک پائی جاتی ہے ہو سکتا ہے قید نے اسے جلا دی ہو؟

"قید کے خفی احساسات اور احتجاج کے جلی تاثرات اُن کی اُردو شاعری میں زیادہ ہیں ــــــــــــــ لازماً ۱۸۵۷ء کے خفی وجلی واقعات نے ان کے دل و دماغ کو متاثر کیا تھا اور یہی وہ زمانہ تھا جب وہ اُردو شاعری کی طرف کچھ زیادہ ہی ملتفت تھے"۔ ــــــــــــــ میں نے کہا

"یہ نقد و بحث کا مسئلہ ہے" ــــــ مولانا نے فرمایا ــــــ جب تک ہم ۱۸۵۷ء کے اِن دنوں کا ان کی شاعری کے ساتھ تقابلی مطالعہ نہ کریں ہم صحیح طور پر کوئی تجزیہ نہیں کر سکتے، تاہم یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ غالبؔ کو ان حالات و واقعات نے شدّت سے متاثر کیا تھا، نتیجتہً اس زمانے کے نالہ ہائے جانکنی کی خراشیں ــــــ ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

مولانا نے غالبؔ کی شاعری کے بارے میں بہت کچھ کہا اور مجھے اس سے پہلے قطعاً تجربہ نہ تھا کہ وہ ادبی شخصیات کے بارے میں بھی اس خوبی سے گفتگو فرماتے ہیں، اور نہ مَیں اپنی ذہنی استعداد کے باعث اس زمانے میں ان مباحث ہی کو سمیٹ سکتا تھا۔

تاثیر مرحوم نے اسلامیہ کالج لاہور میں "فروغ اُردو" کے نام سے ایک تنقیدی مجلس بنا رکھی تھی جس کے باقاعدہ ماہانہ اجلاس ہوتے ان اجلاس میں فورتھ ایر کا کوئی نامور طالب علم کسی ایک موضوع پر مقالہ پڑھتا اور اس پر بحث ہوتی، تاثیر مرحوم کا حلقہ جو نیازمندان لاہور کے نام سے معروف تھا، ظفر علی خاں سے بہر وجوہ حسد کرتا تھا، ان لوگوں نے مولانا کو زچ کرنے کے لئے سازش کی، تب محمود نظامی فورتھ ایر کے طالب علم اور "کریسنٹ" کے ایڈیٹر تھے، بعد میں مغربی پاکستان کے ڈائرکٹر تعلقات عامہ مقرر ہوتے، اب دو سال قبل جواں مرگ ہو چکے ہیں، انہوں نے سیاسی شاعری کے زیر عنوان اردو میں ایک طویل مقالہ لکھا، یا کسی نے ان سے لکھوایا اس مقالہ میں مولانا کا ذکر ہی مفقود تھا طے ان لوگوں نے یہ کیا کہ رمضان کا مہینہ ہے مولانا صدر ہوں محمود نظامی افطاری تک مقالہ پڑھیں اسطرح مولانا کیلئے بولنے کی گنجائش ہی نہ رہے گی۔ کسی شخص نے مولانا کو بھی اس سازش سے مطلع کر دیا۔ مولانا ٹھیک وقت پر کالج میں پہنچ گئے اجلاس شروع ہوا، سب سے پہلے ایک طالب علم نے تلاوت قرآن حکیم کی، اب پروگرام کے مطابق محمود نظامی کو مقالہ پڑھنا تھا کہ مولانا کھڑے ہو گئے، بولنا شروع کیا اور ڈیڑھ گھنٹہ تک بولتے چلے گئے، سیاسی شاعری کا ایک ایک پہلو بیان کیا، نیازمندانِ لاہور مُنہ تکتے رہ گئے۔ تاثیر کا یہ حال تھا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، محمود نظامی بھلا کس ٹہنی کا پتہ تھے مولانا نے تقریر ختم کی اور فرمایا، اب روزہ کھلنے کا وقت ہو رہا ہے اور مَیں سمجھتا ہوں میرے یہ عزیز جو

مقالہ لکھ کر لاتے تھے اس سے زیادہ کیا معلومات پیش کر سکتے ہیں اور نہ ایک طالبعلم کے ذہن ہی میں یہ پہلو ہوں گے؟ لہٰذا آج کی صحبت شکریے کے ساتھ برخاست کی جاتی ہے، مجلس کا رنگ ہی بدل گیا جو طلبا اس سازش سے باخبر اور تاثیر مرحوم کی اُڑان گھاٹیوں سے واقف تھے، انہوں نے مولانا کو آنکھوں پر بٹھا لیا۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا نے اس تقریر میں غالب مرحوم کے اشعار کی سیاسی شرح میں بڑی چابکدستی کا ثبوت دیا، اور یہ بات بڑے وثوق سے کہی تھی کہ غالب جیسا یگانہ روزگار شاعر ماحول کے صدمات سے کیونکر علیحدہ رہ سکتا تھا۔

مولانا غالب کے تذکرہ کو دُور تک لے جا سکتے تھے لیکن جو مضمون میں چھیڑ چکا تھا اُس کے پیش نظر گفتگو کا رُخ پلٹنے کی فکر میں تھا، مَیں چاہتا تھا کہ وہ کچھ کہیں تو جیل ہی کے متعلق کہیں تاکہ مواد فراہم ہو جاتے چنانچہ مولانا کو اپنے ڈھب پر لانے کے لئے بات اٹھاتے ہوتے مَیں نے سوال کیا،

"کل اور آج کی جیلوں میں تو بڑا فرق ہے اب خاصی اصلاحات ہو چکی ہیں"

فرمایا —— ہاں زمین و آسمان کا فرق ہے پہلے جیل بُوچڑ خانے تھے یا قفل گلیں انسان پھاٹکوں اور دیواروں کو دیکھتے ہی کانپ اُٹھتا تھا تحریک خلافت کی اجتماعی گرفتاریوں نے جیل خانوں کا دبدبہ مٹا ڈالا، لوگوں کے دل سے سرکار کا خوف اُٹھ گیا اُس زمانے میں سیاسی قیدی اخلاقی قیدیوں سے بھی زیادہ مجرم خیال کئے جاتے تھے، یہ جو ہم تنگ و تاریک کوٹھڑیوں کے الفاظ بولتے ہیں تو یہ صُورت حال کی ہُو بہو تصویر تھے،

انسان جیل خانوں کی سنگینی ہی سے پاگل ہو جاتا تھا، ایک انسان قید ہوتے ہی شہری آزادی سے محروم ہو جاتا ہے اسی کا نام قید ہے۔ قیدی گویا انسان ہی نہیں رہتا جیل کے حکام جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرتے ہیں، خلافت کی تحریک اور لا تعاون کی تحریک نے جیل خانوں کی ہیئت کذائی بدل ڈالی، خوف مٹ گیا، لوگ جیل جانے میں فخر محسوس کرنے لگے اس سے پہلے قیدیوں کی دنیاوی حیثیت کا خیال بھی نہیں رکھا جاتا تھا، صرف یورپینوں کے لئے امتیاز تھا، وہ نہ تو جیلر کے ماتحت ہوتے اور نہ انہیں عام قیدیوں کے ساتھ رکھا جاتا بلکہ وہ چوری کر کے بھی توس اور مکھن ہی کے حقدار ہوتے تھے، اُن کے لئے رہنے سہنے کا انتظام بھی علیحدہ تھا، ایک یورپین وارڈر ان کی نگرانی کرتا جو براہ راست سپرنٹنڈنٹ کے ماتحت ہوتا، ہر اتوار کو اُن کے لئے پادری آتا، کرسمس کے دن بڑی دھوم دھام سے مناتے وحشیانہ مشقت کا تصوّر بھی اُن کے لئے حرام تھا۔ لاہور سنٹرل جیل میں ان کے لئے ایک خاص وارڈ بنایا گیا جہاں وہ گلچھرے اڑاتے تھے، انہیں اتنی وافر خوراک ملتی تھی کہ سگریٹوں کے عوض خوراک بیچ دیتے تھے —— اُن کا خمیر و ضمیر ہی عجیب تھا، جب ہم لوگ جیل میں گئے اور اس ملک کے بڑے بڑے لوگوں نے جیل خانے کو اپنا گھر بنا لیا تو ان کی دُنیوی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں یورپین قیدیوں کی مراعات دی گئیں مگر اس سے کیا ہوتا تھا آخر انقلابی نوجوانوں کی جد و جہد بالخصوص بھگت سنگھ وغیرہ کی بھوک ہڑتال اور جتیندر ناتھ داس کی موت نے حکومت کو سپر انداز ہونے پر

مجبور کر دیا، جیلخانوں میں اصلاحات نافذ کرنے کے لئے ایک کمیشن قائم کیا گیا جس کی سفارشات پر اے، بی اور سی کلاس کے درجات وضع کئے گئے۔ لطف یا ستم کہہ لیجئے کہ ان سفارشات سے بڑے بڑے خاندانوں کے اخلاقی قیدیوں کو بھی فائدہ پہنچا حالانکہ انہی لوگوں کا قید خانوں کو دوزخ بنانے یا بنوانے میں حصّہ تھا۔ عام اخلاقی قیدی ہمیشہ ہی زندہ درگور رہے، اسی طرح رضا کار سیاسی قیدیوں کی حالت بھی ان سے مختلف نہ رہی بلکہ وہ عام مراعات سے بھی محروم رکھے گئے، مَیں نے اپنی بہت سی نظموں میں اس صورتِ حال کا نقشہ کھینچا ہے —— ۱۹۳۱ء کے اواخر میں مجھے ایک ماہ کے لئے لاہور سنٹرل جیل میں رہنا پڑا تو ان بدنصیبوں کی حالتِ زار نے بے حد متاثر و پریشان کیا یہ تحریک کشمیر کا زمانہ تھا اور احراری نوجوان جیلوں کو بھر رہے تھے، مَیں نے لکھا ؎

آج جن کی یہ خطا ہے کہ ذرا کالے ہیں
پی رہے اُن کا لہُو جیل کے رکھوالے ہیں
کبھی کولہُو کی مشقّت کبھی چکّی کا عذاب
جس سے ہاتھوں میں بچاروں کے پڑے چھالے ہیں
گوشت اور خوُن کے پُرزے ہیں جو انگریزوں نے
قیصریّت کی مشینوں کے لئے ڈھالے ہیں
قید گورے بھی ہیں چوری میں مگر اُن کے لئے

جیل سرکار نے گلزار بنا ڈالے ہیں
ہم کسی بات میں کم اُن سے نہیں ہیں لیکن
اس کو کیا کیجئے وہ گورے ہیں ہم کالے ہیں
رنگ کے فرق پہ موقوف ہے قانونِ فرنگ
یوں نکلتے نئی تہذیب کے دیوالے ہیں
ہو گئے کس لئے کونسل کے سب ارکان خاموش
وہ بھی کیا ان ستم آرائیوں کے آلے ہیں
کملی والے تری اُمّت کو نہ کمل بھی ملے
ٹوپی والوں کو اُڑاتے گئے دوشالے ہیں
بڑے دن کا یہی احرار کو انعام ملا
کہ زد و کوب سے جانوں کے پڑے لالے ہیں
ہو گئیں زندہ روایات اُحد زنداں میں
دانت ٹوٹے ہیں انہیں کے جو خدا والے ہیں
یونہی روتا رہا اسلام تو بہہ نکلیں گے
عرش پر جتنے مکانات کے پرنالے ہیں
نشہ ہو جائے گا دولت کا بہت جلد ہرن
کہہ دو اُن سب سے جو اس نشہ کے متوالے ہیں

مولانا نے فرمایا —— اس نظم کا چھپنا تھا کہ "زمیندار" کا شمارہ ضبط کرلیا گیا حتیٰ کہ ضمانتوں، ضبطیوں اور قرقیوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا، یہ ایک لمبی کہانی ہے منصور سٹیم پریس زمیندار کی ملکیت تھا وہ بھی اس شاخسانہ میں ضبط ہوگیا، غرض "زمیندار" ادارہ تحریر اور مطابع، عمر بھر قید و بند اور ضبطی و تعزیر کا شکار رہے ؎

تھی اس خیال پہ بُنیاد آشیانے کی
کہ بجلیوں کو تمنّا ہے مُسکرانے کی

۱۹ نومبر ۱۹۲۷ء کا "زمیندار" عیدالاضحیٰ نمبر تھا، اس میں اُسوۂ خلیل اللہ کے زیرِ عنوان ایک افتتاحیہ چھپا تو شمارہ ضبط کرلیا گیا میں نے ضبطی پر نظم لکھی اس کے دو شعر تھے ؎

دل ضبط، زباں ضبط، فغاں ضبط، قلم ضبط
دنیا میں ہوتے ہوں گے یہ ساماں کہیں کم ضبط
برطانیہ کا شیوہ رہا گر یہی کچھ روز،
سُن لو گے عزیزو کہ ہوتے دیر و حرم ضبط

یہ نظم بھی ضبط ہوگئی —— ۱۹۳۰ء میں "زمیندار" پر ضمانتوں اور ضبطیوں کے جو لگاتار حملے ہوتے اُن کا خاکہ ایک نظم میں کھینچا ہے، وہ نظم بھی بحقِ سرکار ضبط ہوگئی

دل ضبط، جگر ضبط، زباں ضبط، فغاں ضبط
سب سازِ عیاں ضبط ہے سب سوزِ نہاں ضبط

مظلوم کو فریاد بھی کرنے نہیں دیتے
ڈر ہے کہ نہ ہو جاتے یہ سب امن واماں ضبط
اُٹھتی ہے جو سینے سے تو ہو جاتی ہے ضبط آہ
آتے جو دہن پر وہیں ہوتا ہے گماں ضبط
روکیں گے وہ کیونکر مرے مضموں کی رَوانی
تنکے سے بھی ہوتا ہے کہیں سیلِ رواں ضبط
وہ ضبط کریں مری دوات اور قلم کو
ہو جائیں گے خود ان کے تفنگ اور سناں ضبط
تم ضبط "زمیندار" کے نیر نہیں کرتے
کرتے ہو حقیقت میں محمد کا نشاں ضبط

۱۹۱۳ء میں جب "زمیندار" کی پہلی ضمانت ضبط ہوئی تو ایک احتجاجی نظم کی بعض دلچسپ تلمیحات کو اس شعر پر ختم کیا تھا ؎

فائدہ اس سے اگر ضبط ضمانت کرلی
کاش بتلاؤ مجھے ضبط فغاں کی تدبیر

مولانا نے بہ تفصیل ان تمام واقعات کا ذکر کیا جو "زمیندار" کو ضبطیوں اور قرقیوں کی صورت میں پیش آچکے تھے اور جن صبر آزما حالات سے ادارہ "زمیندار" گزرتا رہا۔ مولانا نے فرمایا، سرمائیکل اڈوائر کو مجھ سے للّٰہی بُغض تھا، وہ حیدرآباد

میں ریزیڈنٹ تھا میرے خلاف حیدر آباد سے انخلا کا جو مواد تیار ہوا، اُس میں اسی کے اشارات کو دخل تھا، اسی کی بدولت مجھے حیدر آباد سے نکلنا پڑا پنجاب میں لیفٹیننٹ گورنر کا عہدہ سنبھالتے ہی اُس نے اپنی برقِ خرمن سوز کے لئے "زمیندار" کو چُن لیا۔ مَیں نے لندن سے ایک مقالہ لکھا جس کا سرِ عنوان تھا ؎

چار چیز است تحفۂ لندن

خر و خنزیر و روزنامہ و زن،

اڈوائر گھات میں تھا، اِدھر مقالہ چھپا اُدھر سخن ناشناسوں کی معرفت ترجمہ پہنچ گیا، پھر کیا تھا نہ صرف یہ کہ "زمیندار" کا دس ہزار زرِ ضمانت ضبط کر لیا بلکہ پریس پر بھی ہاتھ صاف ہو گیا، "زمیندار" تھا کہ ققنس کی طرح خاکستر سے بار بار پیدا ہوتا رہا۔ اس شعر میں تو شاید سر مائیکل کے لئے بھڑک اُٹھنے کا سامان موجود تھا، لیکن دوسری دفعہ پنجاب کے مخصوص خاندانوں کی مخبری پر "زمیندار" کو سودا کے ایک عام شعر کی سزا ملی جو محض ایک ادارے کا طرۂ اظہار تھا ؎

گُل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی

اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی،

اخبار اور ضمانت دونوں ضبط کر لئے گئے، ایک خان بہادر نے جو کاسہ لیسی میں مشہور تھا، سرکار تک جو ترجمہ اپنے حواشی سمیت پہنچایا، وہ اتنا مضحک تھا کہ ضمانت کی ضبطی سے زیادہ اس کے مذاقِ سخن کی پستی کا افسوس رہا یہ خان بہادر

آخرکار اسی نوعیت کی خدمات کے باعث "سَر" ہو گئے اور حکومت کے ہاں بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کیا۔

"زمیندار" جب کبھی سرکار کی نگہِ عتاب آلود کا شکار رہا، اس میں انہی خاندانوں کا ہاتھ رہا، ان لوگوں نے پنجاب کی قومی تحریکوں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا یہ لوگ "زمیندار" کو سرکار انگریزی ہی کا باغی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنی رگِ جاں کے لیے بھی دشنہ و خنجر خیال کرتے تھے، "زمیندار" کو انہوں نے اپنی کاسہ لیسانہ روایات کے حق میں برقِ بلا سمجھا اور گوروں کے کان بھرنے میں کبھی بخل نہ کیا، بلکہ ؏

بڑھا بھی دیتے تھے کچھ زیبِ داستاں کیلئے

ممکن ہے ان میں ایک آدھ گھرانا مغلوں کے وقت سے نامور ہو لیکن زیادہ تر خاندان انگریزوں کی ضرورتوں نے پیدا کئے تھے اور جن کا کچھ حسب نسب تھا وہ مسلمانوں کی حکومت کے باغی تھے انگریزوں نے انہیں پشتینی خدمات کے صلہ میں سردار بنا رکھا تھا انہی لوگوں میں سے انگریزی حکومت کیلئے کارندے منتخب یا نامزد ہوتے، فوج میں انہی لوگوں کی اولاد پر تکیہ کیا گیا پولیس میں انہی کو مواقع دیئے گئے اور جیل خانوں میں بھی انہی خاندانوں کے افراد افسر ہو کے آتے رہے۔ غرض برطانوی سرکار کا ہندوستانی نقشہ ان خاندانوں ہی کے آب و رنگ کا منت پذیر تھا۔

اخلاقی قیدیوں کے جرائم کی کہانیوں سے بعض عجیب عجیب انکشافات ہوتے ہیں ان قیدیوں کو ٹٹولا جاتے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے موجودہ ابتلا

کاشتکار ہیں انہی سے پتہ چلتا ہے کہ ان خاندانوں نے اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے کس قسم کے مجرم پال رکھے ہیں اور ان سے ذاتی اور قومی عداوتوں کے تحت کیا کیا کام لیا جاتا ہے۔

مولانا نے فرمایا، تحریک خلافت کے دنوں میں ان خاندانوں نے پنجاب میں خصوصیت کے ساتھ حق نمک ادا کیا، بلکہ حق نمک سے بھی کچھ زیادہ ہی حق ادا کیا، ملک سے باہر فوج میں بھرتی ہو کر ترکوں کا گلا کاٹا، ملک میں تحریک خلافت کے کارکنوں کو پٹیا، مخبریاں کیں، سرکاری گواہ بن گئے اور بعض کارکنوں کو سرِعام مار مار کر ادھ موا کر دیا، یہاں تک کہ ان لوگوں نے اپنے اضلاع میں تحریک کو داخل نہ ہونے دیا اگر کسی کارکن نے حوصلہ کیا تو وہ ہمیشہ کے لئے "تائب" ہو کر رہ گیا۔ بعض "سرداروں" اور "نوابوں" کے پروردہ جیلوں میں چلے گئے وہاں نوجوانوں کو معافیوں پر آمادہ کیا۔ اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ بعض کم سن نوجوانوں کو ہدفِ گناہ بنایا، غرض ؏

پنبہ کجا کجا نہم تن ہمہ داغ داغ شد

یہاں تک فرما چکے تو مولانا نے توقف فرمایا، گھنٹہ بھر خاموش رہے، پھر سکوت توڑا اور کہنے لگے، ہمارے ہاں جیل خانوں کی آبادی میں اضافہ کا موجب کسی حد تک پولیس بھی ہے جو ایک جُرم دریافت کرنے کے لیے خود دس جرم کرتی ہے، انگریزوں نے ایسا نظام بنا دیا ہے کہ ہندوستانی عمالِ حکومت میں ملکی بھائیوں کے ساتھ ہمدردی کا شائبہ تک نہیں، جب ملازمت میں ترقی کا معیار پکڑ دھکڑ رہ گیا ہو

تو ظاہر ہے کہ مجرم پیدا نہیں ہوتے بلکہ پیدا کیے جاتے ہیں ——— مولانا نے کہا میں نے ایک دفعہ "سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا افسانہ کیا" کے زیر عنوان پولیس کے خدوخال پر ایک مقالہ لکھا تھا، حکومت نے وہ پرچہ ضبط کر لیا مگر جو باتیں اس میں کہی تھیں اُن کا حکومت کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

مولانا نے صوبائی پولیس کے سیاسی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جیلوں کے بھرنے میں پولیس کا ہاتھ بھی ہے؟ پولیس نے تشدد اور ہیبت کی جو بنیاد رکھی ہے اُس سے لوگوں کے حوصلے جوان ہو گئے ہیں، صوبہ کے بعض پولیس افسروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں نے مسلمان نوجوانوں کو مخبر اور ہندو نوجوانوں کو انقلابی بنا دیا ہے۔

مولانا آزردہ ہو گئے فرمایا کہ قیامت کے روز یہ لوگ خدا کو کیا جواب دیں گے، سی، آئی، ڈی کے افسروں کا خصوصیت سے ذکر کیا، اس وقت ان کے لہجہ میں قلق تھا کہہ رہے تھے کہ ان لوگوں نے اپنے عہدوں میں ترقی کی خاطر محض انگریزوں کی خوشنودی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا؟ ان لوگوں نے ہمیشہ رائی سے پہاڑ قطرہ سے دریا اور ذرہ سے میدان بنایا ہے ——— پنجاب سی آئی ڈی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان لوگوں نے ملک سے باہر بھی بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں، اس ضمن میں بعض افراد کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ یہ لوگ پہلی جنگ عظیم میں سہ گونہ خدمات پر مامور تھے، اولاً فوجیوں کے خیالات کی نگرانی کرتے، ثانیاً مسلمان

ملکوں کی جاسوسی۔ تا آنکہ جب کسی اسلامی ملک کا سقوط ہوتا تو برطانیہ کی طرف سے اس کی انتظامیہ میں شریک ہوتے۔ فرمایا کہ ان حضرات ہی کے کارنامے ہیں جن کی بنا پر اسلامی ملکوں میں ہندوستانی مسلمانوں کا اعتبار جاتا رہا ہے۔ مصطفےٰ صغیر کا واقعہ آپ نے خاص طور پر سُنایا کہ کس طرح اس نوجوان کو بنارس سے ترکی بھیجا گیا وہاں اس کی نگرانی کے لئے فلاں صاحب مقرر کئے گئے آجکل وہ سی آئی ڈی میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہیں، پھر کس طرح یہ صاحب مصطفےٰ صغیر کی گرفتاری پر بھاگ نکلے اور ہندوستان پہنچے —— آپ نے اس ضمن میں شیخ الہندؒ کا ذکر کیا کہ جب وہ مالٹا سے چھوٹ کر ہندوستان پہنچے تو ان کے خلاف جن لوگوں کو تفتیش پر مامور کیا گیا ان کا انچارج تو ڈی آئی جی پولیس انگریز تھا لیکن دو ماتحت افسر مسلمان تھے ایک حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بھائی مسٹر مظہر علی تھانوی، دوسرے مولوی عبدالحق بابائے اردو کے بھائی تصدق حسین ہاپوڑی۔ حضرت شیخ الہندؒ جو قال اللہ اور قال الرسولؐ کے سوا کوئی کلمہ زبان پر نہ لاتے تھے، ان دونوں کے بارے میں فرماتے تھے کہ انہوں نے دوران تفتیش مجھے اس حد تک زدوکوب کیا کہ بہیمیت اور بربریت بھی مُنہ چھپانے لگی تھیں۔

مولانا نے فرمایا، محمد علی حجاز گئے یا ئیں حجاز پہنچا تو ہمارے ساتھ بھی اس قبیلے کی متشرع صُورتیں کر دی گئی تھیں، یہ لوگ مکہ معظمہ کا طواف بھی کرتے قبور پر حاضری بھی دیتے۔ مدینۃ النبیؐ میں روضۂ اطہر کے سامنے کھڑے ہوکر گڑگڑاتے

بھی اور ہماری خبریں بھی سرکار انگلشیہ کو بہم پہنچاتے تھے ــــ آپ نے کہا ایسے بیسیوں لوگ ہوں گے جن کے حج ہماری نگرانی کے صلہ میں ہوتے تھے۔

فرمایا، کتنے ہی لوگ ہیں جو ہجرت کے دنوں میں عام مسلمانوں کے ساتھ چلے گئے اور ان میں پھوٹ ڈالنے کے علاوہ مخبری کا فریضہ انجام دیتے رہے آپ نے افسوس ظاہر کیا کہ مکّہ معظمہ اور مدینہ منورّہ میں بھی ان لوگوں نے بڑے خطرناک کام کئے۔

اس ضمن میں شہید گنج کا ذکر چھیڑ دیا کہ اس قضیہ میں سی، آئی، ڈی کا رول کیا رہا اور کس طرح بعض لوگوں کو اپنے حق میں استعمال کیا گیا۔

مولانا نے کہا، میری دلی تمنا رہی ہے کہ مسلمان نوجوان بھی آزادی کی جدوجہد میں حصّہ لیں، مگر خال خال نوجوانوں کے سوا ان کی طبیعت ہی اس طرف رجوع نہیں کرتی ہے ــــ

"ہوسکتا ہے کہ اس میں ہماری لیڈرشپ کا بھی نقص ہو"؟ میں نے عرض کیا "یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن انگریزوں نے مسلمان نوجوانوں کی رُوح سلب کرلی ہے، اور رُوح سلب کرنے کا یہ فرض ان گماشتوں نے انجام دیا ہے جو مسلمانوں کی سیاسی و معاشی زندگی کے اجارہ دار اور انگریزوں کی حکمران مصلحتوں کے آلہ کار ہیں عام مسلمان انہی کی مُٹھی میں ہیں"

مولانا کا یہ ارشاد کسی حد تک بحث طلب تھا لیکن میں چونکہ اُن سے بحث کرنا



آزادی سے

پہلے

’’پسِ دیوارِ زنداں‘‘

ساڑھے دس سال قید کی

سرگزشت‘‘

آزادی کے

بعد

’’تمغۂ خدمت‘‘

تین ماہ سترہ دن کے ایّامِ اسیری کی رُوداد

جب سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں ـــــ

پسِ دیوارِ زنداں

شورش کاشمیری نے اپنی دس سالہ قید کے مشاہدات و محسوسات کو اپنے لہو سے لکھا ہے ـــ ادیب کا قلم، شاعر کی زبان، خطیب کا لہجہ، قیدی کی سرگزشت، جذبات کا طلوع و غروب ـ خیالات کا اتار چڑھاؤ ـــ ساتھیوں کے چہرے، راہنماؤں کے خاکے ایک کہانی نہیں، کئی کہانیاں!

تمغۂ خدمت

تین ماہ سترہ دن کے ایام اسیری کی رُو داد ـ ایک قیدی کی نفسیات کا اظہار، ایک کہانی میں کئی کہانیاں، ایک داستان میں کئی عنوان ـــــ سیاسیات سے لے کر شخصیات تک کی تصویر ـ منٹگمری جیل یا انسانی مذبح خانہ، قیدیوں پر کیا گزرتی ہے؟

شورش کاشمیری کے قلم سے افسانہ سراؤں کی شعبدہ بازی سے زیادہ سچا افسانہ، آنکھوں دیکھا حال، نفس کے واردات، قلب کے تاثرات دماغ کے تصورات، مختلف لمحوں کے محسوسات، قرون مظلمہ کی تصویریں۔

تصویریں نہیں تحریریں

ع جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

—— ایک لحظہ کے لئے آپ سوچیں، کہ آپ اخبار کیوں پڑھتے ہیں؟

تصویروں کے لئے ——

تو معاف کیجئے "چٹان" یہ بُت کدہ سجا نہیں سکتا ——

بازاری ادب کیلئے ——

"چٹان" اس معاملہ میں اپنی تہی دامنی کا اعتراف کرتا ہے۔

"چٹان" کا نصب العین ہے

• دماغی نشوونما • کلمۃ الحق کی اشاعت • اکابر کے سوانح

• معاشرتی احتساب • تہذیبی تجزیہ • سیاسی جا

ایڈیٹر —— شورش

سالانہ قیمت پندرہ روپے
ششماہی " آٹھ روپے
فی پرچہ " ۳۰ پیسے

آپ کی رفاقت کا متمنی
جنرل مینج
ہفتہ وار "چٹان" ۸۵ میکلو